اے بی سی آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

جلد ۔۔۔ ۳۱
شمارہ ۔۔۔ ۹
صفر ۔۔۔ ۱۴۱۷ھ
جون ۔۔۔ ۱۹۹۶ء

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

بیاد
حضرۃ مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ
مدیر :۔ عبدالقیوم حقانی

مدیر اعلیٰ
حضرۃ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ العالی
ناظم ۔ شفیق فاروقی

ایگزیکٹو ایڈیٹر
حافظ راشد الحق سمیع

فون ۶۳۰۳۴۰ ۔ ۰۵۲۲۱

اس شمارے کے مضامین

پاکستان میں سالانہ ۱۲۰/- روپے فی پرچہ ۱۲/- روپے بیرون ملک بحری ڈاک ۶/- پونڈ بیرون ملک ہوائی ڈاک ۱۲/- پونڈ
سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

نقش آغاز

پاکستان کا سالانہ بجٹ یا ٹیکسوں اور مہنگائی کا عفریت

جون کے مہینے میں عموماً پاکستان میں سالانہ میزانیہ اور بجٹ پیش کیا جاتا ہے۔ حسب معمول امسال بھی 97-1996 کا بجٹ بھی قوم کو دیا گیا۔ بجٹ سے پہلے پوری قوم کبھی بھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوئی کہ مہنگائی کا عذاب اٹھایا جائے گا یا ارزانی اور اشیائے صرف کی فراوانی کا دور دورہ ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارا ملک آئی ایم ایف جیسے عالمی یہودی ادارہ کے آہنی شکنجہ میں ایسا گھرا ہوا اور کسا گیا ہے کہ اس مگرمچھ کے جبڑے سے اسکا نکلنا محال ہے اور آج پاکستان اس عالمی شاطرانہ بساط کا ایک بے بس مہرہ ہے، جبکہ ہمارا حکمران طبقہ خواہ جو بھی ہو، وہ اسکے اشارہ ابرو سے سرمو بھی اختلاف نہیں کرسکتا اور وہ اسکی تعمیل میں مجبور و مضطر اور لاچار ہے۔ آنچہ استاذ ازل گفت ہماں میگویم

مملکت خداداد پاکستان اسلام اور لاالٰہ الااللّٰہ کے مقدس نعرہ پر حاصل کیا گیا تھا لیکن ایک عظیم الشان قربانی کے بعد جب یہ ملک منصہ شہود پر نمودار ہوا تو حکمران طبقہ پاکستان کی نظریاتی اساس سے منحرف ہوگیا۔ بعد میں یار لوگوں نے کہا کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ یہاں پر شریعت مطہرہ کا نفاذ ہوگا بلکہ ہم نے تو یہ ملک مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے حاصل کیا تاکہ مسلمان ہندو ساہوکاروں اور سود خواروں سے نجات حاصل کرسکیں لیکن افسوس آج پاکستان کی اقتصادی حالت اور معاشی زبوں حالی اقوام عالم پر آشکارا ہے۔ پورا ملک کرپشن، رشوت، لوٹ کھسوٹ اور اقربا پروری کی لپیٹ میں ہے اور بعض افراد کا یہ کہنا کہ پاکستان عنقریب کرپشن میں عالمی

چمپیئن بن جائے گا ۔ بالکل بجا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ تمام تر خرابی اس نظام کی ہے جس میں روز بروز غریب ، غریب تر اور امیر ، امیر تر ہوتا جارہا ہے ۔ جب تک اس غیر منصفانہ طبقاتی نظام کو جڑ سے نہیں پھینکا جاتا ، یہ مجبور اور مقہور عوام اس طرح ظلم کی چکی میں پستے جائیں گے ۔

موجودہ بجٹ جو کہ پانچ کھرب بیس کروڑ روپے اور اس میں دو کھرب روپے کا خسارہ ہے جبکہ ٹیکسوں کے ذریعہ ۳۰۷ ارب روپے عوام سے وصول کیے جائیں گے اور اکثر ماہرین اس خدشہ کا اظہار کررہے ہیں کہ یہ حتمی بجٹ نہیں ہے بلکہ اس مالی سال کے دوران مزید منی بجٹ پیش کیے جائیں گے جس میں ۴ ارب روپے کے ٹیکس کی مزید قسطوں کی نوید بھی قوم سنے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ پوری قوم نے من حیث المجموع اس بجٹ کو مسترد کرتے ہوئے اسے قوم کے لئے قاتل بجٹ قرار دیا بلکہ عوام اس کہنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ بجٹ الفاظ کے گورکھ دھندوں ، اعداد کی ہیرا پھیری اور زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں ۔ جس میں غریب ، مزدور ، تنخواہ دار اور متوسط طبقہ بری طرح بےبس کردیا گیا ہے ۔ غیر ضروری اور غیر پیداواری اشیاء کی طرف خصوصی توجہ دینے کا اندازہ اس اخباری اطلاع سے ملاحظہ ہو ۔ بجٹ کے تفصیلی اعداد و شمار سے قطع نظر آئندہ مالی سال کے دوران وزیر اعظم سیکرٹریٹ کی تعمیر و مرمت کے لئے ۱۵۳ء۸ ملین سے زائد خرچ کئے جائیں گے ۔ ۵۶ ملین کی رقم صرف پی ایم ہاؤس کے لئے مختص کی گئی ہے ۔ وزیر اعظم سیکرٹریٹ کے جملہ اخراجات کے لئے ۹۳ء۳۷ ملین روپے رکھے گئے ہیں ، جبکہ نیشنل ہاؤسنگ اتھارٹی جیسے ادارے کے لئے صرف ۲ ملین روپے مختص کئے گئے ۔ ایوان صدر میں سوئمنگ پول کی تعمیر پر گزشتہ سال ۵ ملین روپے رکھے گئے تھے جس پر شدید عوامی رد عمل سامنے آیا تھا ۔ امسال ایوان صدر کے سوئمنگ پول کے لئے مزید ۳ء۷ ملین روپے مختص کردیئے گئے ، گویا سوئمنگ پول پر دو سال میں کل اخراجات ۱۲ء۳ ملین روپے ہوگئے ۔

اس تناظر میں آکر دیکھا جائے تو اس سے ہمارے حکمران طبقہ کی ذہنیت او
ترجیحات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آج جو ٹیکسوں کی بھرمار ہے اسکا براہ راست
اثر غریبوں، مزدوروں اور متوسط طبقہ پر پڑتا ہے جبکہ اربوں، کھربوں روپے بغ
ڈکار لئے ہضم کرنے والے امراء، جاگیردار اور سرمایہ دار اپنے استحصالی منصوبوں
بدستور عمل پیرا رہیں گے اور ان سے بازپرس کرنے والا کوئی نہیں۔ ضرورت
اس امر کی ہے کہ ہمارے حکمران ایسا بجٹ عوام کو دیں جس سے نہ صرف قوم
زبوں حالی آسودہ حالی میں بدل جائے بلکہ پیداواری اور صنعتی نظام مزید مستحکم
ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے ساتھ ساتھ ملک کی سرحدات کی حفاظت پر
بھی کڑی نظر رکھی جائے کیونکہ جب تک ملک مضبوط نہ ہو، اسکی سرحدات اور
بارڈر مستحکم نہ ہوں، عوام اور قوم بے معنی رہیں گے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ
ہمارے پڑوس میں ہمارا ازلی دشمن بھارت ہمارے وجود تک کو برداشت نہیں
کرسکتا اور اسلحہ کے ڈھیر اور انبار لگانے میں دیوانگی کی حد تک مصروف ہے۔
ہمیں اس محاذ سے بالکل غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ بجائے اسکے کہ ہم پر تعیش اشیاء
اور لہو لعب کے لئے خطیر رقومات مختص کردیں، اپنے دفاع اور مادر وطن کی
ناموس و حفاظت کے لئے یہ رقوم اور روپے استعمال میں لائے جائیں۔

اور قوم کے نام ہمارا یہ پیغام ہے کہ گرانی اور مہنگائی یہ اللہ کی طرف سے
ایک عذاب ہے اور اللہ تعالی کے عذاب اور گرفت سے بچنے کے لئے رجوع اور
انابت الی اللہ ضروری ہے تاکہ وہ قادر مطلق ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت وما توفیقی الا باللہ

(راشد الحق)

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

قرآن مجید کا تاریخی کارنامہ

نظام کائنات سے استدلال کی دعوت ، سائنسی تحقیقات کی ترغیب

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یورپ کو سائنس کے میدان میں بام عروج تک پہنچنے کے لئے ہزاروں ، لاکھوں آدمیوں کی قربانی دینی پڑی جو کلیسا (Church) اور سائنس کی کش کش کا طویل اور خونی باب ہے ، مگر اسلام کی تاریخ اس قسم کی کسی آزمائش اور عبرتناک داستان سے آشنا نہیں ہے کیونکہ اسلام عیسائیت کی طرح تجربے و مشاہدے کا دشمن اور علم کا گلا گھوٹنے والا نہیں بلکہ علم و تجربے کو پروان چڑھانے والا اور مشاہدے کی ہمت افزائی کرنے والا ہے ۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی ساری ترقیاں قرون وسطی کے مسلمانوں کے تجربات و مشاہدات اور بلند پایہ تحقیقات کا نتیجہ تھیں ۔ اور مسلمانوں کی تمام ترقیاں قرآن حکیم کی انقلابی دعوت فکر کا منطقی نتیجہ تھیں ، جو یونانی طرز فکر سے بنیادی طور پر مختلف ہے ۔ لہٰذا مسلمان فکر یونان سے سیراب ہونے کے باوجود ارسطو اور دیگر حکماء کے مقلد جامد نہیں رہے ، بلکہ انہوں نے قرآنی فکر اور اسکے منشا کے مطابق بہت جلد تجربات و مشاہدات شروع کرکے جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی اور ایک بالکل نئے عہد کا آغاز کیا ۔

قرآن حکیم دنیا کا وہ پہلا صحیفہ ہے جو غلط نظریات و مفروضات اور تقلید پرستی کی مذمت کرتے ہوئے نظام کائنات سے استدلال کرتا ہے اور زمین ، آسمان ، چاند ، سورج ، ستارے ، ابر ، ہوا ، پہاڑ ، مختلف حیوانات و نباتات وغیرہ تمام مظاہر فطرت کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرنے کی مختلف اسالیب میں تاکید کرتا ہے ۔ مثلاً ـــ

انظروا الی ثمرہ اذا اثمر و ینعہ ، ان فی ذالکم لایات القوم یؤمنون ۔ غور سے دیکھو اس کے پھل کو جب وہ پھلنے اور پکنے لگے ۔ یقیناً اس باب میں ایمان لانے والوں کے لئے دلائل و نشانات موجود ہیں ۔ (انعام : ۹۹) ولقد جعلنا فی السماء بروجاً و زیناھا للناظرین ۔ اور ہم نے آسمان میں بہت سے بروج (کہکشائیں) بنادی ہیں اور بغور دیکھنے والوں کے لئے انہیں مزین کردیا ہے ۔ (حجر : ۱۶) افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۔ والی السماء کیف رفعت ۔ والی الجبال کیف نصبت ۔ والی الارض کیف سطحت ۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹوں کی تخلیق کس طرح کی گئی ہے ؟ اور آسمان کیسے اونچا اٹھایا گیا ہے ؟ اور پہاڑ کس طرح (مضبوطی سے) نصب کئے گئے ہیں

اور زمین کس طرح (اس کی پوری گولائی میں) بچھائی گئی ہے؟ (غاشیہ: ۱۷ـ۲۰)

قل انظروا ماذا فی السماوات والارض ۔ کہدو کہ تم غور سے دیکھو کہ زمین اور اجرام سماوی میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں؟ (یونس: ۱۰۱) قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق کہدو کہ زمین میں چل پھر دیکھو تو سہی کہ تخلیق کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ (عنکبوت: ۲۰)

ان تمام آیات میں سب سے زیادہ قابل غور اور مرکزی لفظ "نظر" ہے، جس کے مشتقات انظروا، الناظرین اور افلا ینظرون ہیں ۔ "نظر" کے معنی محض دیکھنے کے نہیں ہیں بلکہ ماہرین لغت اور ائمہ تفسیر کے مطابق غور وفکر کرنے اور "نظر غائر" ڈالنے کے ہیں ۔

نظرہ: تاملہ بعینہ (القاموس المحیط، از مجد الدین فیروز آبادی) اس شخص نے (فلاں چیز پر) نظر ڈالی یعنی اپنی آنکھ کے ذریعہ اس چیز کا جائزہ لیا ۔

الجوھری: النظر تامل الشئی بالعین ۔ (لسان العرب، ۲۱۵/۵، طبع جدید، بیروت، ۱۹۶۸ء) جوہری نے کہا ہے کہ نظر آنکھ کے ذریعہ غور کرنے یا جائزہ لینے کا کام ہے ۔

امام راغب لکھتے ہیں: نظر کے اصل معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کی (اصلیت) کا ادراک کرنے کے لئے آنکھ یا قوت فکر کو بار بار حرکت دینے (تقلیب) کا نام ہے اور کبھی "نظر" سے مراد غور و فکر اور کسی چیز کی کھود کرید کرنا (مطالعہ و تحقیق) ہوتا ہے ۔ اور کبھی اس سے مراد وہ معرفت ہوتی ہے جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے ۔ اس لئے محاورے میں کہا جاتا ہے "نظرت فلم تنظر" تو نے دیکھا مگر غور نہیں کیا ۔ ارشاد باری (قل انظروا ماذا فی السماوات) میں انظروا کے معنی ہیں تاملوا ۔ یعنی غور کرو ۔ لفظ نظر کا استعمال عوام کے نزدیک زیادہ تر "رویت بصر" کے لئے ہوتا ہے، جب کہ خواص کے نزدیک اسکا استعمال زیادہ تر بصیرت کے لئے ہوتا ہے ۔
(مفردات القرآن، از راغب اصفہانی، ص ۴۹۷ ۔ مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت)

یہ محض ائمہ لغت ہی کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مفسرین نے بھی اس لفظ سے یہی معنی مراد لئے ہیں ۔ چنانچہ اوپر جو آیات نقل کی گئی ہیں، ان میں سے انعام والی آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشری تحریر فرماتے ہیں: نظرا اعتبار و استبصار و استدلال ۔ عبرت و بصیرت اور استدلال کی نظر سے دیکھو ۔ (تفسیر کشاف، ۴۰/۲، مطبوعہ ایران ۔

مفسر ابو سعود تحریر فرماتے ہیں ـ ای انظروا الیہ نظرا اعتبار استبصار اذا اخرج ثمرہ ۔ یعنی جب پھل نمودار ہونے لگے تو اس کو بچشم عبرت و بصیرت دیکھو ۔ (تفسیر ابو سعود، برحاشیہ

سیر کبیر ، ۲۴۹/۴ ، مطبع عامرہ مصر ، ۱۳۲۴ھ)

امہ رشید رضا مصری تحریر فرماتے ہیں : اي انظروا نظر تامل و اعتبار ۔ یعنی غور و فکر اور رت کی نظر سے دیکھو ۔ (تفسیر المنار ، ۷/۴۴۳ ، دار المعرفۃ بیروت)

اس لحاظ سے " نظر " محض سرسری طور پر دیکھنے کے نہیں بلکہ غور سے دیکھے ، غور و فکر کرنے لر بصیرت ڈالنے اور بچشم عبرت معائنہ کرنے کے ہیں ۔ اب پچھلی آیتوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا ، " نظر " کا دائرہ عالم جمادات ، عالم نباتات ، عالم حیوانات اور عالم افلاک تک تمام مرئی و محسوس ر کل موجودات زبردست پر محیط ہے ۔ یہ قرآن حکیم کی ایک زبردست خصوصیت ہے کہ وہ ملبی اور ایجابی دونوں حیثیتوں سے اپنے متبعین کو خصوصاً اور نوع انسانی کو عموماً موجودات عالم کے مطالعے و مشاہدے پر ابھارتا ہے اور ان مظاہر و ظواہر کی ساخت و پرداخت اور ان نظاموں کا نظم مطالعہ کرنے نیز ان اشیاء و حوادث کے علل و اسباب کا پتہ لگاکر ایک مسبب الاسباب ہستی تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے ۔ وہ بار بار حجت کی خاطر الزامی طور پر کہتا ہے : اولم ینظرون فی ملکوت السماوات والارض وما خلق اللہ من شی ۔ ۔کیا انہوں نے زمین و آسمان کی بادشاہت اور اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں غور نہیں کیا ؟ (اعراف ۱۸۵۔)

اولم یر الذین کفروا ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنھما ، وجعلنا من الماء کل شیء حی ، افلا یومنون ۔کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ (پہلے) زمین اور (تمام) اجرام سماوی باہم ملے ہوئے تھے ، جنکو ہم نے جدا کردیا اور پانی ہی سے زندہ چیز کو بنایا ۔ تو کیا یہ لوگ (پھر بھی) ایمان نہیں لائیں گے ؟ (انبیاء : ۳۰)

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فسلکه ینابیع فی الارض ثم یخرج به زرعاً مختلفاً الوانه ثم یھیج فتراہ مصفراً ثم یجعله حطاماً ، ان فی ذالک لذکری لالی الالباب ۔ اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے بلندی سے پانی برسایا ۔ پھر اسکو زمین کے سوتوں میں داخل کردیا ۔ پھر وہ اسی پانی کے ذریعہ رنگ برنگی کھیتیاں نکال دیتا ہے ۔ پھر وہ کھیتی خشک ہوجاتی ہے جسکو تو زرد ہوتے ہوئے دیکھتا ہے ۔ پھر وہ اسکو چورا چورا کردیتا ہے ۔ اس باب میں دانش مندوں کے لئے ایک بڑی چونکا دینے والی (خبر) ہے ۔ (زمر ۲۱)

اوپر دو قسم کی آیات نقل کی گئی ہیں ۔ قسم اول عملی سائنس (Practical Science) کی بنیاد ہیں ۔ جن سے سائنسی علوم کی باقاعدہ تدوین عمل میں آتی ہے اور قسم ثانی منکر و معاندین کے لئے بطور اتمام حجت وارد ہوئی ہیں ۔ اس طرح یک پنت دوکاج کے بمصداق قرآن کی نظر میں اس

دعوت فکر و تحقیق کے دو بنیادی مقاصد ہیں، جس کی مختصر تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے۔

(۱) اسلام کے بنیادی مقاصد اور اس کے اساسی نظریات و معتقدات خصوصاً توحید، رسالت اور معاد کے اثبات اور ان کی صداقت و حقانیت کے لئے نظام کائنات سے دلائل پیش کرنا، تاکہ ان کی حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجائے اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ جیسا کہ دوسرے مواقع پر اس اصول کی تفصیل اس طرح دی گئی ہے: وفی الارض آیات للموقنین، وفی انفسکم افلا تبصرون۔ اور روئے زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے تمہاری ہستیوں میں بھی۔ کیا تم کو نظر نہیں آتا؟ (ذاریات: ۲۰۔ ۲۱)

(۲) اہل اسلام کو خصوصیت کے ساتھ تسخیر موجودات کی طرف راغب کرنا، یعنی موجودات عالم میں جو طبیعی اور نوعی فوائد ــ قوانین فطرت کے روپ میں ــ موجود ہیں۔ ان سے استفادہ کرکے انسانی زندگی کو بہتر بنانے اور دین برحق کے غلبے کے لئے فوجی و عسکری حیثیت سے قوت و شوکت حاصل کرنے کی ترغیب دلانا، تاکہ اس سے خلافت ارض کے دیگر مقاصد پورے ہوں اور اقوام عالم کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام پائے۔ بالفاظ دیگر اہل اسلام سائنسی علوم و فنون میں ترقی کرکے اتنی قوت و طاقت بھی حاصل کرلیں کہ ایک حیثیت سے وہ دین الٰہی کو تمام ادیان پر، مادی نقطہ نظر سے ــ غالب کر سکیں۔ (غلبہ دین کی دو صورتیں ہیں، ایک تو دلیل و استدلال کے ذریعہ غالب کرنا اور دوسرے مادی و ظاہری حیثیت سے برتری حاصل کرنا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے یہ دونوں پہلو بیک وقت مطلوب ہیں، ورنہ خاطر خواہ نتائج نکل نہیں سکتے اور دین برحق علمی اعتبار سے برحق ہونے کے باوجود مادی و عسکری حیثیت سے اپنا دفاع نہیں کرسکے گا جیسا کہ موجودہ حالات شاہد ہیں) تو دوسری طرف دنیا میں خدائی فوجدار بنکر عدل و انصاف اور اصلاح عالم کا فریضہ بھی انجام دے سکیں (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ الخ) اسی وجہ سے بنی آدم کو "علم اسماء" اور "علم تسخیر" سے بھی نوازا گیا ہے۔

(الحق رپورٹ)

صلیبی دنیا اور اسلام

عیسائی صلیبی جنگوں کو نہیں بھولے اور وہ اب بھی کسی نئے صلاح الدین ایوبی کے تصور سے خوف زدہ ہیں۔
انہیں ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ مسلمان ایک بار پھر قوت بن جائیں گے اور ان سے عالمی قیادت چھین لیں گے۔
اسی خوف نے ان کے ہاتھوں شاہ فیصل کو اور ضیاء الحق کو شہید اور الجزائر میں جمہوریت کا بستر گول کرایا۔ عالم
سلام کے جس لیڈر پر بھی انہیں شک گزرتا ہے کہ مستقبل میں وہ اسلامی دنیا کا قائد بن سکتا ہے پہلے تو اس کی
ردار کشی کرتے ہیں، اگر اس سے کام نہ چلے تو پھر اسے موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ سوویت یونین اور سرد جنگ کے
ماتمے کے بعد مغرب اسلام سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گیا ہے حالانکہ نہ تو اسلام صرف مسلمانوں کا دین ہے اور نہ
سلمان اہل مغرب کا برا سوچتے ہیں۔ اسلام پوری انسانیت کے لیے دین ہے اور ایک سچا مسلمان وہی ہے جو دوسروں
کا بھلا سوچے۔ دوسرے کو غلام یا مطیع بنانا مسلمان کی سوچ نہیں ہو سکتی۔ ایک سچے مسلمان کا تو نصب العین ہی یہ ہے کہ
ق خدا کو شرک سمیت ہر قسم کی برائی اور گناہ سے روک کر اسے جہنم میں جانے سے بچا لے۔ دوسروں پہ بزور قوت
بضہ کرنا یا تسلط جمانا، اسلامی نظریہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود مغرب پر خوف طاری ہے، اسی لیے صلیبی دنیا نے
لمانوں کے خلاف ایک غیر اعلانیہ جنگ شروع کر رکھی ہے۔ یہ جنگ کیا صورت اختیار کرے گی اور صلیبی دنیا نے
جنگ کیوں شروع کر رکھی ہے، اس کو سمجھنے کے لیے عالمی ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والے چند تبصرے
ں میں دیئے جا رہے ہیں۔

یکولر فرانس اور اسلام

(وال اسٹریٹ جنرل کی رپورٹ)

فرانس میں پردے کو چھوت کی بیماری سمجھا جاتا ہے اور وہاں کی باپردہ مسلم طالبات
سبق کے بجائے اپنی مشکلات کو سمجھنے میں مصروف ہیں۔ ایشین وال اسٹریٹ جنرل کے مطابق گزشتہ دنوں
یورسٹی کی ایک طالبہ بشریٰ کو پروفیسر نے انتباہ کیا کہ وہ اسکارف یا کلاس میں سے کسی ایک چیز کو ترک کر دے۔
ے ہفتے جب یہ طالبہ کلاس شریک ہوئی تو پروفیسر نے کلاس لینے سے انکار کر دیا اور احتجاجاً کلاس چھوڑ کر باہر نکل
تیسرے ہفتے جب طالبہ نے باحجاب رہتے ہوئے کلاس لینے پر اصرار کیا تو پروفیسر نے اس کا بازو پکڑ کر کلاس سے
بردستی باہر نکال دیا اور خود دروازے پر کھڑا ہو گیا تاکہ طالبہ کلاس میں داخل نہ ہو سکے۔ ۲۲ سالہ طالبہ نے کہا کہ پروفیسر

کا رویہ بالکل بچگانہ تھا اور ایسا لگتا تھا گویا بچوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔ بچوں کی لڑائی جیسے یہ واقعات فرانس میں اب عام ہو چکے ہیں اور پروفیسر سمجھتے ہیں کہ حجاب کے استعمال سے فرانس کی اقدار کے تباہ ہونے کا خدشہ ہے جب کہ طالبات اس کو اپنا حق سمجھتی ہیں جس سے فرانس اور مسلم طبقے میں خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ مذکورہ طالبہ نے کہا کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا جیسے مجھ کو چھوت کی بیماری لاحق ہے جو دوسروں کو لگ جائے گی۔ مذکورہ طالبہ کی رائے بالکل درست ہے اور فرانس کی حکومت اب مسلم اقدار کو چھوت کی بیماری ہی خیال کرنے لگی ہے جو فرانس سے بڑھتی ہوئی پورے مغربی یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ الجزائر کی اسلامی لہر نے فرانس کے خدشات میں اضافہ کر دیا ہے اور وہاں کے پالیسی ساز "اسلامی لہر" سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی مناسب پالیسی کی تشکیل پر غور کر رہے ہیں۔ ایک ہفت روزہ کے مطابق اسلام اب فرانس کا نمبر ایک خطرہ بن چکا ہے جس کے باعث فرانس کی روایتی آزاد خیالی کو نقصان پہنچ رہا ہے کیوں کہ اگر اسکارف کا استعمال ہونے دیا گیا تو بھی اقدار تباہ ہو جائیں گی اور اگر اس پر پابندی عائد کی گئی تو یہ بھی آزاد خیالی کے نظریات کے منافی ہوگا۔ درمیانی راہ کون سی ہو سکتی ہے، یہ فیصلہ ابھی وہاں کے پالیسی ساز نہیں کر سکے ہیں۔

(سنڈے ٹائمز کی رپورٹ)

اسلام کا خطرہ اور مغربی رہنما

مغرب کے پاس ان دنوں کوئی عظیم رہنما نہیں ہے اور اسلام ایک خطرے کی صورت میں ابھر رہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کے رہنما اس تدبیر، بصیرت اور دور اندیشی سے محروم ہیں جو تاریخ کے اس موڑ پر مطلوب ہے۔ آج کل سیاست جس رخ پر پروان چڑھ رہی ہے اس سے انتہائی کم اہل لیکن حکمرانی کے خواہش مند قائدین سامنے آتے ہیں جن کے فیصلے وقتی ہوتے ہیں اور وہ دور تک دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ ایسے کارنامے کرنے کی باتیں کرتے ہیں جن سے وہ تاریخ کے صفحات میں جگہ بنا سکیں لیکن تاریخ کے صفحات میں جگہ خواہشات سے نہیں بلکہ نظریات سے بنتی ہے۔ سنڈے ٹائمز نے سال نو کے حوالے سے مغربی قائدین کا ایک مجموعی تجزیہ شائع کیا ہے اور مغرب کے جمہوری نظام کے مقابل ابھرتے ہوئے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان قائدین کی صلاحیتوں پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ تجزیئے میں کہا گیا ہے کہ سرد جنگ کے بعد کے دور کو آسان سمجھا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے سے ملنے والی کامیابیاں بھی سرد جنگ کے ساتھ ہی ماضی کا حصہ بن چکی ہیں اور اب ایک ایسے رہنما کی تلاش ہے جو صدی کے آخری حصے میں ماضی کی جانب تکنے سے بجائے رجائیت کے ساتھ مستقبل پر نظر جما سکے لیکن نظریات کی عدم موجودگی کے سبب کوئی نئی راہ تراشنے کا اہل رہنما نظر نہیں آتا اور تاریکی بڑھ رہی ہے۔ سرد جنگ کے خلاف مؤثر حکمت عملی تیار کرنے والے ذہن ضعیف العمری، بیماریوں اور سیاسی انتشار کا شکار ہو کر دنیا کی شکل و صورت کے مطابق پالیسیاں تیار کرنے کیلئے

نااہل ہو چکے ہیں۔ مرکزی کردار امریکہ کا ہے جہاں کا صدر خود اپنے ملک میں وسط مدتی الیکشن میں شکست فاش سے دوچار ہو چکا ہے اور مغرب کی ترجمانی کرنے کے بجائے کرداری کمزوریوں اور سیاسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتا ہے۔ روس سرد جنگ کا شکار ہو کر اپنے زخم چاٹنے میں مصروف ہے۔ اس کی معیشت پر بدامنی کا راج ہے اور عوام کے سامنے کوئی واضح منظر نامہ نہیں ہے چین نئی سرد جنگ کی ابتدا کرتا نظر آتا ہے۔ جان میجر اپنی پارٹی کی سلامتی کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ لندن اور واشنگٹن کے روابط خصوصی نہیں رہے ہیں۔ صدر متراں کی صحت گر رہی ہے اور ان کے جانشین خاندان کو اہمیت دیتے ہیں۔ اٹلی غیر یقینی صورت حال میں گھرا ہوا ہے۔ جرمنی کے چانسلر کوہل ذرا بہتر ہیں لیکن انہیں خود اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ مغرب کے قائدین میں ان کا مقام کیا ہے۔ انہی قائدین سے کام چل سکتا تھا اگر درپیش خطرات ذرا کم ہوتے لیکن چیلنجز غیر معمولی ہیں اور یہ رہنما خود فریبی میں مبتلا ہیں اور سرد جنگ کی کامیابی کو اختتام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مغرب آئندہ کے چیلنجز کے لیے بالکل بھی تیار نظر آتا۔ بوسنیا کے تنازعہ نے اس صورت حال کو مزید واضح کر دیا ہے۔ جمی کارٹر ایک نئے ثالث بن کر ابھرے ہیں لیکن اگر ان کی بھاگ دوڑ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے تباہی کو مؤخر کر رہے ہیں۔ عوام میں رہنماؤں کے لیے عدم احترام کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور تاریخ کا حصہ بننے کے دعوے داروں کے ناموں کے سورج بدنامی کے غاروں میں ڈوب رہے ہیں۔ نئے سیاست دان بد سے بدتر ثابت ہو رہے ہیں نئے سال کا آغاز ہے اور یہ سوچ مایوسی میں اضافہ کر رہی ہے۔

اسلام کے خلاف ریڈرز ڈائجسٹ کی میڈیا وار

دنیا کے کئی ممالک اور کئی زبانوں میں شائع ہونے والا امریکی ماہنامہ "ریڈرز ڈائجسٹ" ان دنوں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا مہم میں مصروف ہے اور اس ادارے نے اسلام کے خلاف منافرت پھیلانے والے اپنے مضامین کی عام اشاعت کی اجازت دے دی ہے تاکہ اسلام کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی رفتار تیز کی جا سکے۔ اپنے ایک تازہ مضمون میں ریڈرز ڈائجسٹ نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست فاشسٹ اور کمیونسٹ ریاستوں سے مشابہت رکھتی ہے جب کہ ایک جگہ مسلمانوں پر طنز کرتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ دوسروں پر اسلام مسلط کرنے کو جہاد کہتے ہیں۔ ڈائجسٹ اسرائیلی ذرائع پر انحصار کرتا ہے اور ایک منصوبے کے تحت اسلام کے خلاف منافرت پھیلا رہا ہے اور اسلامی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ ڈائجسٹ کا یہ زہریلا پروپیگنڈہ قارئین پر منفی اثرات مرتب کر رہا ہے اور ایک حالیہ سروے کے مطابق اتنتیس فیصد امریکی باشندے اب مسلمانوں کو خطرہ تصور کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والے جرائم پر کوئی احتجاج کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

(امپیکٹ انٹرنیشنل کی رپورٹ)

جرمنی بھی فرانس کے نقش قدم پر

فرانس کے بعد جرمنی بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میڈیا وار میں شریک ہو چکا ہے اور وہاں کے سیاستدانوں نے متفقہ طور پر اسلام اور شریعت کو جرمنی کے آئین سے متصادم قرار دے دیا ہے جس کے بعد جرمنی میں مقیم مسلمانوں میں بھی فرانس کے مسلمانوں کی طرح تشویش کی لہر پیدا ہو گئی ہے۔ امپیکٹ انٹرنیشنل کے حالیہ شمارے کے مطابق جرمنی کے ذرائع ابلاغ بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ شروع کر چکے ہیں جس کا اثر اسلام کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے جرمن باشندوں پر نظر آنے لگا ہے۔ گزشتہ فروری میں جرمنی کے سربراہ چانسلر ہلمٹ کوہل نے سالانہ کانفرنس برائے سیکورٹی پالیسی کے سلسلے میں اسلامی بنیاد پرستی کو سنگین خطرہ قرار دیتے ہوئے یورپ میں اسلامی توسیع پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جانے کا مشورہ دیا تھا جس کے بعد جرمن اخبارات میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مضامین کا سیلاب آگیا اور ذرائع ابلاغ نے اسلام کو یورپ کے لیے کمیونزم سے بھی بڑا خطرہ ثابت کرنا شروع کر دیا۔ ایک موقر فرانسیسی روزنامے کے مطابق یورپ کو درپیش اسلامی خطرے کا موثر مقابلہ کرنے کے لیے پیرس اور بون میں قریبی تعاون پایا جاتا ہے۔ چانسلر ہلمٹ کوہل کے خیال میں پورے یورپ میں انتہا پسندوں کی سب سے بڑی تعداد جرمنی میں موجود ہے۔ صدر کلنٹن اور ہلمٹ کوہل کی ملاقاتوں میں بھی شمالی افریقہ کے حوالے سے اسلام سے پیدا شدہ خطرے کو سرفہرست موضوع کی حیثیت حاصل رہی تھی لیکن سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ جرمنی کے قانون دان اور دستور نویس اسلامی قوانین اور شریعت پر اعتراض کرتے ہوئے مشورہ دے رہے ہیں کہ اسلامی حقوق سرکاری منظوری کے مستحق نہیں ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اگر یہ خیالات سرکاری پالیسی کی شکل اختیار کر گئے تو جرمنی میں آباد پچاس لاکھ مسلمانوں کو برابری کے حقوق حاصل کرنے میں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے باعث اسکول کے مسلمان بچوں سے دینی تعلیمات کے حصول کا حق چھین لیے جانے کا خدشہ ہے۔ فی الحال جرمنی میں مسلمان بچوں کو اپنے دین کی تعلیمات کے حصول کا حق حاصل ہے لیکن اگر یہ تعلیمات جرمنی کے آئین سے متصادم ثابت ہو گئیں جس کا اندیشہ ہے تو مسلمان بچے اسکولوں میں اپنے دین کی تعلیم حاصل کرنے کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جرمنی میں مسلمان باشندوں کو اہم عہدوں سے برطرف کر دیا جائے گا۔ جرمنی کے مسلمانوں نے ان تمام خطرات کو واضح طور پر محسوس کرنا شروع کر دیا ہے جو ذرائع ابلاغ کے زہریلے پروپیگنڈے کے باعث پیدا ہو سکتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ جرمنی بھی مسلمانوں کے خلاف معاندانہ مہم شروع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ آنے والوں دنوں میں بڑھتا ہی جائے گا۔ وہ پروپیگنڈے کا توڑ کر سکتے ہیں اور نہ حملوں کا جواب دینے کی بھرپور سکت رکھتے ہیں لہذا جرمنی کے آئینی شہری ہونے کے باوجود اجنبی ہو چکے ہیں۔

امریکی وکلاء پر مسلمانوں کی دہشت

مسلمانوں سے تعصب اور یہ خوف کہ انتہا پسند ہمیں مار ڈالیں گے کی وجہ سے امریکی وکلاء کی اکثریت ورلڈ ٹریڈ سینٹر نیویارک کے

دھماکے میں ملوث نابینا مصری عالم شیخ عمر عبدالرحمٰن اور ان کے گیارہ ساتھیوں کے خلاف مقدمہ کے پینل میں شمولیت کے لیے تیار نہیں۔ اب تک ۱۰۰ میں سے ۲۴ وکلا کا پینل کے لیے انتخاب ہوا ہے اور امریکیوں کے خوف کا یہ عالم ہے کہ ان کے نام انتہائی خفیہ رکھے جا رہے ہیں اور نام کی بجائے انہیں شناخت کے لیے نمبر دے دیئے گئے ہیں، حتیٰ کہ امریکی ڈسٹرکٹ جج کو بھی ان کے ناموں کا علم نہیں۔ . . . وکلا کو پینل میں شمولیت کے لیے جو سوالنامہ دیا گیا اس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا ہے۔ سوالنامے میں پوچھا گیا ہے کہ مقدمہ میں ملوث ملزمان مذہب اسلام کے پیروکار ہیں اور آپ اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں کیا موقف رکھتے ہیں۔ ایک وکیل نے تحریر کیا کہ مجھے اسلام اور مسلمانوں سے واقعتاً بغض ہے کیوں کہ مسلمان اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایک اور وکیل نے لکھا کہ مجھے مذہبی جنون خوفزدہ کرتا ہے اور اگر میں ان کے خلاف مقدمہ میں دلائل دوں تو مجھے اپنے اور خاندان کے قتل کر دیئے جانے کا خدشہ ہے۔ تیسرے نے کہا کہ میں غیر جانبدار نہیں ہو سکتا کیوں کہ میرا ایک بھائی مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے جو پان ایم کی لاکربی اسکاٹ لینڈ کے مقام پر تباہ ہونے والی پرواز میں تھا۔ اس طیارے کی تباہی کا الزام لیبیائی باشندوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ بعض وکلاء نے تحریر کیا کہ نیویارک کے عرب ٹیکسی ڈرائیور بہت بدتمیز ہیں لہٰذا مسلمانوں سے نفرت فطری ہے جب کہ ایک وکیل کا موقف ہے کہ میں ایک ایسے پیٹرول پمپ سے اپنی گاڑی کے لیے پیٹرول لیتا ہوں جس کا مالک مقدمہ میں ملوث مسلمان محمد صالح ہے مجھے اس سے نفرت ہے واضح رہے کہ نیویارک ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں بم دھماکے میں ملوث ان ملزمان کے خلاف مقدمے کی کارروائی جو شروع ہو چکی ہے اس کے کئی ماہ تک جاری رہنے کا امکان ہے جب کہ اس مقدمے میں ملوث چار افراد کو پہلے ہی عمر قید کی سزائیں دی گئی ہیں۔

فرق باطلہ کا تعاقب

قادیانیت

ڈاکٹر محمد سلیم احمد

قادیانی اور برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی

برصغیر ہندو پاکستان ایک سے زیادہ مذاہب کے ماننے والوں کی سرزمین ہے۔ لیکن اس میں دو بڑے مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اولاً ہندو پھر مسلمان اس کے بعد بدھ، عیسائی، سکھ اور دوسرے مذاہب آتے ہیں۔ ہندو مذہب اس سرزمین کا سب سے قدیم مذہب ہے۔ اسلام کے ماننے والوں نے جنہیں مسلمان کہا جاتا ہے، اس سرزمین میں تقریباً ساتویں صدی عیسوی میں قدم رکھا، ابتداء میں ان کی تعداد مختصر تھی، لیکن پھر یہیں کے رہنے والے ہندوؤں، بدھوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس مذہب کو بخوشی و رغبت قبول کرنا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھی کہ اسلام برصغیر کا دوسرا بڑا مذہب ہوگیا۔

باوجودیکہ اسلام نے برصغیر ہندو پاکستان میں تیزی سے ترقی و مقبولیت کے منازل طے کیے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی حائل ہوتی رہیں، جس کے باعث اسلامی سوسائٹی تقسیم اور شکست و ریخت کا شکار بھی ہوتی رہی۔ اور آج بھی ہے، مسلمانوں کی اس اندرونی کمزوری کی وجہ سے کسی حد تک مقا[می] ہندو مذہب کے پیروکاروں نے فائدہ اٹھایا جس میں ان کی مسلمانوں کے خلاف مزاحمت شامل ہے۔ لیکن بڑ[ی] وجہ خود مسلمانوں کے اندر تقسیم کا عمل تھا، جو عقائد کی بنیاد پر وجود میں آیا، اس وجہ سے اسلامی اتحاد کو اکثر و بیشتر برے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

اسلام کے ابتدائی دور ہی سے برصغیر کی اسلامی سوسائٹی شیعہ اور سنی عقائد کی بنیاد پر بٹی رہی، یہ تقسیم آج بھ[ی] جاری ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی متحدہ قوت ہمیشہ سے کمزوری کا شکار رہی ہے۔ دوسری کمزوری پندرہویں صد[ی] میں سید محمد جونپوری (۱۴۴۳ – ۱۵۰۴ء) کی مہدوی تحریک ہے جس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں ایک اور [فر]قے کی بنیاد ڈالی۔ آج مہدوی تحریک کے پیروکار جنوبی ہند میں بہت جگہ پائے جاتے ہیں، برصغیر کے دو[سرے] علاقے بھی ان سے خالی نہیں، لیکن برصغیر کے جس علاقے میں مہدوی تحریک کے پیروکار ایک منظم گروہ کی شکل او[ر] بڑی تعداد میں موجود ہیں، وہ پاکستان کا صوبہ بلوچستان ہے جہاں وہ "ذکری" فرقے کی شکل میں موجود ہیں۔

انیسویں صدی میں برصغیر پر انگریز حکمرانی کے دوران مسلمانوں میں عقائد کو بنیاد بنا کر ایک اور فرقے ک[ی]

ابتداء ہوئی جس نے مسلمانوں کی وحدت کو اور کمزور کر دیا۔ اس نئے فرقے کے بانی مرزا غلام احمد (۱۹۰۸ - ۱۸۳۹) تھے، جو پنجاب کے ایک ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوئے۔ چونکہ وہیں سے انہوں نے اپنی تحریک کی ابتداء کی، اس لیے ان کے عقائد کو ماننے والے قادیانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مرزا غلام احمد نے جو عقیدہ دیا اس کے مطابق وہ خود ہادی رسول اور اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ قادیانیوں کے عقائد کیا ہیں، یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اسلامی عقائد میں تحریف یا قطع و برید کر کے جو گروہ وجود میں آئے ان کی وجہ سے اسلامی اتحاد کو برصغیر میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ قادیانیوں نے مسلمانان برصغیر کی جدوجہد میں کیا کردار ادا کیا، اس مختصر مضمون میں اس پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہاں صرف ایک دو حوالوں سے ہی گفتگو ہو سکے گی۔

مرزا غلام احمد کا خاندان ایران سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے ضلع گورداسپور میں آ کر آباد ہوا تھا۔ یہ خاندان مغلوں کے برلاس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کی آمد برصغیر کے پہلے مغل فرمانروا (۱۵۳۰ - ۱۵۲۶) ظہیر الدین بابر کے دور میں ہوئی۔ جلد ہی یہ خاندان گورداسپور میں جہاں ان کے آباء نے پڑاؤ ڈالا جاگیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، اور اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔

مرزا غلام احمد نے ابتداء میں سرکاری نوکری کی۔ لیکن شروع ہی سے یہ مذہب کی طرف کچھ زیادہ ہی راغب تھے، جس کے نتیجہ میں اسلام کی تبلیغ کے کام میں غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے، انہوں نے اپنے تبلیغی کام کا آغاز قرب و جوار کے نچلے طبقوں جو بھنگیوں اور کوڑا کرکٹ اٹھانے والوں پر مشتمل تھا کی بستیوں میں جا کر کیا لیکن انیسویں صدی کے اختتام سے قبل ہی مرزا غلام احمد نے نبی اور مبلغ ہونے کا اعلان کر دیا۔ انہی خیالات کو بنیاد بنا کر قادیانی مذہب کی تبلیغ کو اپنا مطمع زندگی بنالیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سال ۱۹۰۱ء میں اس وقت کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں مرزا کے پیروکاروں کی تعداد "۱۱۱۳" تک جا پہنچی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ برصغیر کے دیگر علاقوں میں بھی اس وقت قادیانی تھے یا نہیں لیکن یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ معمولی تعداد میں ان کے پیروکار برصغیر کی دوسری جگہوں پر بھی ضرور پیدا ہو گئے ہوں گے۔

مرزا غلام احمد کے مذہبی خیالات سے انگریزوں کو کوئی تعرض نہ ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی تحریک اور خیالات کو انگریزوں نے اپنے لیے مفید پایا۔ کیونکہ ان کی تعلیمات میں یہ عنصر شامل تھا کہ حاکم وقت کے خلاف مسلمانوں کو کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ انگریزوں کی مدد کریں۔ انہی عقائد کو بنیاد بنا کر مرزا غلام احمد نے یہ بھی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لیے اب جہاد فرض نہیں رہا۔ بالخصوص صغیر کے مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ یقینی طور پر یہی وجہ رہی ہوگی کہ انگریز حاکموں نے نہ صرف رزا غلام احمد کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی، بلکہ اسے اپنے لیے مفید سمجھ کر ہمت افزائی بھی کی۔

۱۹۰۷ء کی خفیہ محکمہ کی ایک رپورٹ میں جو سیکریٹری حکومت ہند کو بھیجی گئی تھی، مرزا غلام احمد کی تحریک و عقائد کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کے عقائد سے صریحاً حکومت کے لیے وفاداری کی جھلک ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد کے عقائد کی بناء پر ان کے بیٹے سلطان احمد کو جو پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر تعینات ہیں اپنے باپ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور نہ ہی ان کا اپنے باپ سے کوئی رابطہ ہے۔

مرزا کی ذاتی شخصیت کے بارے میں بھی اس خفیہ رپورٹ میں تحریر کیا گیا ہے جس کے مطابق مرزا غلام "بد عورتوں کا رسیا ہے اور خاص طور سے وہ اپنے پیروکاروں کی خواتین کے درمیان اپنا زیادہ وقت گزارتے ہیں"، سیکرٹری حکومت ہند نے ان معلومات کی روشنی میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا، مرزا غلام احمد ایک "دھوکے باز" شخص ہے۔

حکومت برطانیہ کے نزدیک مرزا غلام احمد اور ان کی تحریک کی خواہ کچھ ہی اہمیت کیوں نہ رہی ہو مسلمانانِ برصغیر نے قادیانی تحریک کو اسلامی اتحاد میں ایک اور دراڑ کی نظر سے دیکھا جیسے جانا تھا۔ اس لحاظ وہ لوگ جو اسے اسلام کے لیے خطرہ سمجھتے تھے انہوں نے اس کے سدباب کے لیے کوششیں شروع کر لیکن ان کی کامیابی محدود ہی رہی۔ دوسری طرف قادیانیوں نے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی جس میں وہ مسلسل کامیابی حاصل کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔

بیسویں صدی کا اوّل نصف برصغیر ہند و پاکستان میں ہندو اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی تاریخ ہے۔ ان میں ایک عنصر مشترک تھا۔ دونوں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مسلم سیاسی تحریک کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ تھا انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں کی بالادستی سے بھی چھٹکا حاصل کرنا۔ قادیانی رہنماؤں نے مسلمان تحریک آزادی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مقصد اس کا کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتا کہ قادیانیوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس اسکیم پر پہلا باقاعدہ عمل وقت ہوا جب برصغیر کے مسلمان خلافت کے مسئلہ پر الجھے۔

جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۸ - ۱۹۱۴) جس میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا۔ نے ترکوں کی سلطنت عثمانیہ پر دور رس اثرات ڈالے۔ ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ جنگ کے خاتمے پر نہ صرف ترکی کے زیر اثر علاقے اس سے چھین لیے گئے بلکہ ترکی کے سلطان کو جس کی حیثیت خلیفہ "المسلمین کی بھی تھی کچھ وقت نہ ر اس کے علاوہ ترکوں کا اپنا علاقہ اناطولیہ ہی یورپی طاقتوں کی سیاست کا مرکز بن گیا۔ مقصد ترکوں ایک بہت ہی مختصر علاقے تک محدود کرنا تھا۔ اس بات کا فیصلہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے

فرانس کے دارالحکومت پیرس میں مفتوح یورپی اقوام کو کرنا تھا۔

برصغیر کے مسلمانوں نے ترکی کے ساتھ اس زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی، گو اس وقت ان کی سیاسی جماعت کل ہند مسلم لیگ موجود تھی، جسے قائم ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے لیکن مسلم لیگ سیاسی جماعت تھی نہ کہ مذہبی، لہٰذا اس کے رہنماؤں کا یہ خیال بجا طور پر صحیح تھا کہ ترکوں اور خلافت کا معاملہ مذہبی معاملہ ہے اور اسے مسلمانوں کی مذہبی جماعت کے ذریعہ حل کروانا بہتر ہوگا۔ مزید یہ کہ مسلم لیگ مسلمانان برصغیر کے مذہبی ثقافتی و سیاسی حقوق پر تو آواز اٹھا سکتی تھی لیکن برصغیر کے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا اس کے منشور میں کوئی ذکر نہ تھا۔ تاہم مسلم لیگ کے ہر ممبر کو ترکی اور خلافت سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اس لیے طے یہ کیا گیا کہ ایک علیحدہ کانفرنس کر کے اس مسئلہ پر متحدہ آواز اٹھائی جائے۔

مسلم لیگ کے سیکرٹری سید ظہور احمد نے بڑی تگ و دو کی اور ایک کل ہند مسلم کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ یہ کانفرنس لکھنؤ میں ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو خاص خلافت کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلائی گئی۔ کانفرنس میں ملک کے طول و عرض سے علماء اور غیر علماء مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اہم بات اس کانفرنس کے حوالے سے قادیانیوں کی شرکت اور مسلمانوں کے رد عمل کی ہے۔

جماعت احمدیہ قادیان نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک وفد بھیجا جو مولوی شیر علی ناظر اعلیٰ جماعت احمدیہ، مولوی سرور شاہ، ناظر تعلیم احمدیہ مدرسہ لاہور، ماسٹر محمد دین، ہیڈ ماسٹر تعلیم السلام مدرسہ قادیان یعقوب علی تراب احمدی ایڈیٹر الحکم اور چودھری محمد ظفر اللہ خان (م ۱۹۸۴ - ۱۸۹۳) صدر جماعت احمدیہ لاہور پر مشتمل تھا۔

بشیر الدین محمود (م ۱۹۶۵ - ۱۸۸۹) نے جو مرزا غلام احمد کے جانشین تھے ایک طبع شدہ پیغام اپنے وفد کے ہمراہ اس غرض سے بھیجا کہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا جائے۔ لیکن کانفرنس کے منتظمین نے احمدیہ جماعت کے وفد کو نہ صرف کانفرنس میں شریک کرنے بلکہ تقریر کرنے کے لیے وقت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ احمدیہ قائدین جو پیغام کانفرنس کے ذریعہ پہنچانا چاہتے تھے وہ ان خیالات پر مبنی تھا کہ مسلمانان برصغیر کو سلطان ترکی اور اس کے خلیفہ ہونے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ سلطان کو خلیفہ نہ ماننے والے احمدی ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ شیعہ اور اہل حدیث بھی شامل ہیں۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کو کسی قسم کی تحریک خلیفہ کی حمایت میں نہیں کرنی چاہیے، اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ نہ صرف حکومت برطانیہ کے مجرم ہوں گے بلکہ اس کے ناشکر گزاروں میں سمجھے جائیں گے۔

اپنے مقاصد میں ناکامی پر قادیانی وفد نے لکھنؤ میں پریس کانفرنس کر کے اپنے خیالات اور حکمت عملی

کو مسلمانوں تک پہونچانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ کیونکہ کسی اخبار نے ان کے خیالات کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قادیانی اپنے عقائد اور سحت عملی دونوں کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں ناکامیاب رہے۔ نیز یہ کہ من حیث القوم مسلمانوں نے قادیانیوں کو اپنا حصہ ماننے سے انکار کردیا۔

قادیانیوں کو مسلم لیگ کی سطح پر اس وقت کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی جب ۱۹۳۱ء میں ظفر اللہ خان کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا صدر چنا گیا۔ یہ اجلاس جس افراتفری کا شکار رہا اس کا ذکر یہاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جس جگہ اجلاس ہونا طے پایا تھا وہاں اجلاس نہ ہوسکا، کیونکہ لوگ ظفر اللہ خان کو صدر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دو تین جگہ اجلاس کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔ بالآخر یہ اجلاس ایک قادیانی نواب علی خان صاحب کے مکان پر کیا جا سکا۔ نواب علی، قادیانی رہنما بشیر الدین محمود کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ یہ بتانا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس اجلاس کے انعقاد کے لیے بشیر الدین محمود نے مسلم لیگ کی خراب مالی حالت کے پیش نظر کچھ رقم بھی بطور عطیہ دی تھی۔ مسلم لیگ کا یہ واحد اجلاس تھا جس میں صدارتی خطبے کے بغیر کام چلایا گیا۔ ابتداً اجلاس کی صدارت کے لیے محمد علی جناح (۱۹۴۸ - ۱۸۷۶) اور پھر آغا خان (۱۹۵۷ - ۱۸۷۷) کو دعوت دی گئی تھی۔ لیکن ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو آغا خان نے تار کے ذریعہ مسلم لیگ کے سیکرٹری محمد یعقوب (۱۹۴۲ - ۱۸۷۹) کو اطلاع دی کہ "ان کا اور جناح کا آنا ناممکن ہے" اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لندن میں ہندوستان کے مسائل کے حل کے سلسلے میں گول میز کانفرنس کا سلسلہ جاری تھا۔ اس وجہ سے برصغیر کے مسلمان رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد وہاں گئی ہوئی تھی۔ کسی مقتدر شخصیت کی عدم دستیابی کے باعث ظفر اللہ خان کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن مسلم لیگ کا یہ سالانہ جلسہ کچھ کامیاب ثابت نہ ہوا، کیونکہ کسی کھلی جگہ پر اس اجلاس کو کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ ۱۹۳۳ء میں جب چودھری رحمت علی نے (۱۹۵۱ء - ۱۸۹۷ء) گول میز کانفرنس کے موقعہ پر ہی لندن میں اپنی پاکستان اسکیم "اب یا کبھی نہیں" (NOW OR NEVER) شائع کی تو ظفر اللہ خان جو اس وقت لندن میں تھے اور جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے برصغیر کی سیاسی حالت پر اپنا نقطہ نظر پیش کر رہے تھے۔ کمیٹی کے چیئرمین نے جب ان سے پاکستان اسکیم کے بارے میں سوال کیا تو اس کے جواب میں ظفر اللہ خان نے کہا کہ یہ تو طلباء کے ذہن کی اختراع ہے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۹۳۷ء میں برصغیر میں ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہوا۔ اس سال پہلی بار صوبائی سطح پر برصغیر کے

لوگوں کو حکومت کا انتظام ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سونپا گیا۔ اس کا بڑا فائدہ ہندوؤں کو پہنچا۔ چنانچہ ملک کے تقریباً سات صوبوں میں ہندوؤں نے اپنی سیاسی جماعت کانگریس کے جھنڈے تلے، حکومتیں تشکیل دیں۔ یہ انتظام دو سال تک جاری رہا۔ لیکن اس دوران مسلمانوں کو بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں ہندوؤں کی حکومت کے تحت زندگی گزارنے کا تلخ تجربہ بھی ہوا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے سالانہ جلسے میں برصغیر کی تقسیم یا پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ قادیانیوں کو ان حالات نے بڑی حد تک پریشانی اور شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے تقسیم اور پاکستان کے قیام کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھا۔ اس کا اندازہ مسلم لیگ اور قادیانیوں کے درمیان ان مذاکرات سے ہوتا ہے جو مطالبہ پاکستان کے فوراً بعد قادیانی رہنماؤں نے نہ صرف مسلم لیگ اور اس کے قائد محمد علی جناح سے کیے بلکہ مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری سے بھی اپنی جماعت اور اس کی اہمیت کے حوالے سے بات چیت کی۔ لیکن یہ مذاکرات ناکام رہے۔ اس تمام گفت و شنید کی اطلاع مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری نے نوابزادہ لیاقت علی خان (۱۹۵۱ء۔ ۱۸۹۵ء) کو، جو ۱۹۳۶ء سے مسلم لیگ کے سیکرٹری منتخب ہوتے چلے آرہے تھے، اپنے ایک خط مورخہ ۹ اگست ۱۹۴۰ء کو لکھ کر بھیجی۔ یہ تفصیلات تاریخی اعتبار سے دلچسپ تاریخی اور اس وجہ سے بہت اہم ہیں۔

ابتداء میں ناظر قادیان مسٹر جناح سے مصالحت کرنا چاہتے تھے، جس چیز کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنی کچھ تجاویز پیش کیں، وہ یہ تھیں کہ ان کی جماعت کے لوگ منظم ہی نہیں باہم متحد بھی ہیں اگر مسلم لیگ نے ان کو مراعات نہ دیں تو وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں گے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا، "یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں کریں"۔ صاف ظاہر ہے صدر مسلم لیگ نے کسی بھی قسم کی سودے بازی سے انکار کر دیا۔ اس بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلم لیگ اور اس کے رہنما تجارت کے اصولوں میں سے کسی ایک کو بنیاد بنا کر مسلم لیگ کے لیے حمایت حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ جناح صاحب سے مایوس ہو کر ناظر قادیان نے مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکرٹری سے گفت و شنید کی بنیاد ڈالی اس کی ابتداء اس خط سے ہوئی جو انہوں نے ۱۹ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا، مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری سے بھی جماعت قادیان مطمئن نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکرٹری کے جوابات نے تو اسے ناظر قادیان کے غیض و غضب کا شکار بنا دیا۔ اس کی تفصیل لکھتے ہوئے انہوں نے اپنے خط حوالہ درج بالا میں لیاقت علی خاں سے

شکایت بھی کی۔ قادیانی رہنماؤں کو مسلم لیگ سے جو شکایت تھی اور جس کا وہ ازالہ چاہتے تھے وہ پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک تھی۔ ناظر قادیان کا کہنا تھا کہ ۳۷-۱۹۳۶ء کے الیکشن میں پنجاب میں ان کے قادیانی ہونے کے خلاف تحریک چلائی گئی، جس کی وجہ سے ان کی انتخابی مہم پر برے اثرات پڑے تھے۔ ان کو خدشہ تھا کہ آئندہ بھی کسی موقعہ پر یہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ کو چاہیئے کہ اپنے دستور کے ذریعہ قادیانیوں کو اسلام کے دائرے میں ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دے۔ یہ ایک مشکل ہی نہیں ناممکن تجویز تھی ایسی صورت میں مسلم لیگ اسس کو کیسے قبول کر سکتی تھی اور ہوا بھی یہی۔

مسلم لیگ کے اسٹنٹ سیکرٹری نے ناظر قادیان کو اس بارے میں جو وضاحت پیش کی جس کا خلاصہ انہوں نے لیاقت علی خان کو لکھ کر بھیجا وہ یہ ہے۔

"اگر ہم لفظ "مسلمان" کی اپنے دستور میں تشریح و تعریف کریں گے تو اس سے معاملات بہت خراب ہی نہیں ہوں گے، بلکہ بغاوت کی شکل اختیار کریں گے۔ یہ غیر تشریح شدہ لفظ ہی تھا، جس کے باعث ظفر اللہ خان مسلم لیگ کی صدارت کے عہدے تک پہونچے اور جو کچھ اعلیٰ حیثیت ان کی اس وقت ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔"

اسٹنٹ سیکرٹری کی یہ بات بھی قابل غور ہے جو انہوں نے لیاقت علی خان کو قادیانیوں کے مسلمان ہونے کے بارے میں لکھی۔ بقول ان کے اگر لفظ "مسلمان" کی تشریح کرنا ضروری ہی سمجھا جائے تو پھر ناظر قادیان سے مجھے (اسٹنٹ سیکرٹری) یہ پوچھنے کا حق ہے کہ وہ خود دوسرے مسلمانوں کے لیے اپنا نقطۂ نظر واضح کریں جو احمدی یا قادیانی نہیں ہیں، کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ قادیانیوں کے بانی کے فتوے کے مطابق دوسرے تمام مسلمان "کافر" ہیں۔ میں بلا خوف تردید یہ بات کہتا ہوں کہ قادیانیوں کا یہ فتوے ہی ہے جس نے ان کے اور دیگر مسلمانوں کے درمیان وسیع اختلاف کی خلیج حائل کردی ہے۔ یہ خلیج لفظ "مسلمان" کی تشریح کرنے سے ختم نہیں کی جا سکتی، یہاں یہ بات قابل غور وفکر ہے کہ پاکستان کی حکومت نے قادیانیوں کو کافر قرار دے دیا ہے۔ جس کے باعث اکثر یہ فیصلہ تنقید کا شکار رہتا ہے۔ لیکن تنقید نگاروں نے اس فیصلے کو کبھی قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد کے اس فتوے کی روشنی میں جانچنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے اپنے آپ کو مسلمان اور دیگر تمام مسلمانوں کو "کافر" قرار دیا۔ اور صورت حال آج بھی قادیانیوں کے نزدیک یہی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے حوالے سے جو گفتگو ناظر قادیان سے ہوئی اس پر روشنی مزید ڈالتے ہوئے

اسسٹنٹ سیکرٹری نے واضح کیا کہ مسلم لیگ میں شمولیت فرقوں کی نمائندگی کی بنیاد کے اصول پر نہیں رکھی گئی ہے۔ لہٰذا قادیانیوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ تعداد میں زیادہ بہت منظم و متحد جماعت ہیں اس لیے انہیں مخصوص نمائندگی کا حق دیا جائے بالکل غلط مطالبہ ہے۔ اور مسلم لیگ کو اس میں کوئی کشش نظر نہیں آنی چاہیئے۔ بقول سیکرٹری قادیانیوں کے دعوے بتاتے ہیں کہ وہ "عددی" بیماری (MEGALOMANICE) (بڑائی کا ضبط۔ بڑے کاموں کا ضبط) کا شکار ہیں۔

اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قادیانیوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنے لیے ایک کارآمد ہتھیار سمجھ کر استعمال کرنے کی ایک سے زیادہ بار کوشش کی لیکن عامۃ المسلمین نے ان کے تمام حربے بےکار کر دیئے۔ دوئم یہ کہ قادیانیوں کو اگر قانونی طور سے پاکستان میں "کافر" قرار دے دیا گیا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے اپنے فتاویٰ کے مطابق قادیانیوں کے علاوہ سب مسلمان کافر ہیں۔ قادیانیوں کے بارے میں تحریک آزادی کے حوالے سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ ان کا رویہ آزادی اور مطالبہ پاکستان کی تحریکوں میں اپنے خاص مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے تھا نہ کہ قومی بھلائی کی نیت سے۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ اشتیاق حسین قریشی۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ کراچی ۱۹۶۷ء

انعام الحق کوثر "سید محمد جونپوری اور ذکریت" بحوالہ مجلہ تاریخ و ثقافت پاکستان ۱۹۹۲ء

غلام محمد جعفر "ذکری مذہب کی مختصر تاریخ اور اس کے معتقدات" بحوالہ مجلہ تحقیق پنجاب یونیورسٹی۔ ۱۹۹۲ء۔

بحث و نظر

ڈاکٹر حافظ محمود اختر

عہدِ عثمانؓ میں جمع قرآن
چند اعتراضات کا جائزہ

حضرت عثمان رضؓ نے جمعِ قرآن کا جو کارنامہ سرانجام دیا اس کی بنا پر امت نے آپ کو "جامع القرآن" کا دائمی خطاب دیا۔ اس سے امتِ مسلمہ کو ایسا مصحف ملا جس میں تمام کی تمام سات حروف (سبعہ احرف) ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ لیکن بعض حلقوں نے قرآنِ مجید کے متن کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے آپؓ کے اس کارنامے کو غلط رنگ دیا، کئی ایک روایات، جن میں "جمع عثمان" کا ذکر ملتا ہے، کو غلط طور پر پیش کیا اور مفروضات کی ایک عمارت تعمیر کر ڈالی ہے، زیرِ نظر مضمون میں ہم حضرت عثمان رضؓ کے اس کارنامہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل اشکالات پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کام بلا جواز کیا۔ اس کے پس منظر میں ان کے سیاسی عزائم کارفرما تھے۔

۲۔ مستشرق بلاشر (BLACHERE) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے ذاتی غرض سے اپنی اور دیگر مہاجرین کی اہمیت جتانے کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ [۱]

۳۔ حضرت عثمان رضؓ نے اپنے مصحف کے علاوہ قرآنِ مجید کے باقی نسخے جلا دیئے۔ گویا قرآن کا بہت سا حصہ ضائع کر دیا گیا۔ [۲]

۴۔ حضرت عثمان رضؓ نے جن لوگوں کو تدوین کمیٹی کا رکن بنایا، ان میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو حضور ص کے [illegible] ہوئے ماہرینِ قرآن میں سے ہو۔ [۳]

۵۔ تدوین کمیٹی کے ارکان کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض روایات میں ان ارکان کی تعداد بارہ اور بعض میں چار ہے۔ گویا یہ معاملہ ابہام کا شکار ہے۔ [۴]

۶۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو حضرت عثمان رضؓ کی اس کارروائی سے اختلاف تھا۔ انہوں نے لوگوں کو اپنے مصاحف حکومت کے سپرد کرنے سے منع فرمایا۔ [۵]

۷۔ حضرت عثمان رضؓ نے اگرچہ مسلمانوں کے اختلافات مٹانے کے لیے یہ کارروائی کی، لیکن یہ اختلافات ختم نہ ہو سکے۔ کیونکہ آپ رضؓ کے بعد بھی لوگوں کے پاس ذاتی مصاحف موجود رہے۔[۱۶]

۸۔ جب حضرت عثمان رضؓ نے قرآنِ مجید کا ایک باضابطہ نسخہ تیار کروایا، اس وقت تک مسلمانوں میں قرآنِ مجید کے بارے میں بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور ان اختلافات کو ختم کرنا ممکن نہ تھا۔[۱۷]

۹۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی قائم کردہ کمیٹی نے جب اپنا تیار کردہ نسخہ آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اس میں اغلاط موجود ہیں اور اہلِ عرب اپنی زبان سے ان کی اصلاح کر لیں گے۔

یہاں ان روایات و اشکالات کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

کیا حضرت عثمان رضؓ کی یہ کارروائی بلا جواز تھی؟ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے عہد میں جب قرآن مجید جمع ہو چکا تھا تو پھر آپ کو دوبارہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حقائق اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ کی یہ کارروائی بلا جواز تھی۔ تمام معتبر کتب حدیث میں وہ روایت موجود ہے جو حضرت عثمان رضؓ کی اس کارروائی کا سبب بنی۔ اس روایت کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے وہ روایت یہ ہے۔

عن ابن شهاب انّ انس بن مالك	ابن شہاب روایت کرتے ہیں، انس بن مالک رضؓ
حدّثه انّ حذيفة بن اليمان قدم	نے بیان فرمایا کہ حضرت حذیفہ بن الیمان
على عثمان وكان يغازى اهل الشام	آذر بائیجان کی لڑائی کے بعد حضرت
فى فتح ارمينية واذربيجان مع	عثمان رضؓ کے پاس آئے، انہیں قرآنِ مجید کی تلاوت
اهل العراق فافزع حذيفة	میں لوگوں کے اختلاف نے بہت پریشان کر دیا تھا
اختلافهم فى القراءة، فقال	انہوں نے حضرت عثمان رضؓ سے کہا! اے امیر المومنین
حذيفة لعثمان، يا امير المومنين	اس امت کی خبر لیجئے اس سے قبل کہ وہ
ادرك هٰذه الامة قبل ان يختلفوا	اپنی کتاب میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف
فى الكتاب اختلاف اليهود والنصارىٰ[۱۸]	کرنے لگیں۔

یہ ایک طویل روایت ہے۔ اس جگہ اس کا صرف وہی حصہ نقل کیا گیا ہے جتنا مطلوب تھا۔ آئندہ چل کر باقی روایت بھی زیر بحث آئے گی۔ یہ روایت واضح کر رہی ہے کہ اختلاف موجود تھا اور اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کا انسداد کیا جائے۔ اس اختلاف کے بارے میں ایک اور روایت ابن اشتہ نے

ایوب کے طریق پر ابوقلابہ رضؓ سے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بنو عامر کے ایک شخص انس بن مالک نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں قرآن میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ پڑھنے والے بچوں اور معلموں کے درمیان تلواریں نکل آئیں۔ حضرت عثمان رضؓ کو اس کی خبر ملی تو فرمایا کہ لوگ میرے سامنے ہی قرآن کو جھٹلانے اور اس میں غلطی کرنے لگے ہیں تو جو لوگ مجھ سے دور ہوں گے وہ ان لوگوں کی نسبت زیادہ جھٹلانے والے اور غلطی کرنے والے ہوں گے۔ اے اصحاب محمدؐ تم جمع ہو جاؤ اور لوگوں کے لیے ایک امام (قرآن کا ایک راہنما نسخہ) لکھو۔[۱۱]

ایک اور روایت ہے کہ ایک قاری کے شاگرد دوسرے قاری کے شاگرد سے جھگڑتے۔ وہ کہتے کہ تم غلط پڑھتے ہو اور دوسرے پہلے کو غلط قرار دیتے اور ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے[۱۲]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کام بلاجواز نہیں کیا بلکہ اس کی ضرورت موجود تھی۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس "اختلاف" سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس ابتدائی دور میں ہی قرآنِ مجید کا متن اختلافات کا شکار ہو چکا تھا اور ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے پڑھنے لگا تھا۔ اس اختلاف کی نوعیت مولانا تقی عثمانی کے الفاظ میں یوں ہے۔

حضرت عثمان رضؓ کے دور تک اسلام عرب و عجم میں پھیل چکا تھا۔ صحابہ کرام تبلیغ دین کے سلسلے میں بلاد و امصار میں پھیل چکے تھے۔ صحابہ کرام رضؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں میں قرآنِ مجید پڑھا تھا۔ ان حضرات نے اسی انداز سے قرآنِ مجید اپنے شاگردوں کو پڑھایا۔ دور دراز کے لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے کہ قرآنِ مجید کے بعض الفاظ ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت تھی۔ اسی بنا پر لوگوں میں جھگڑے کھڑے ہونے لگے۔ ایک شخص اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتا۔ ان حالات میں اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ قرآن مجید کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ دوسرے حضرت زید بن ثابت رضؓ کے لکھے ہوئے نسخے کے سوا پورے عالم اسلام میں کوئی نسخہ نہ تھا جو پوری امت کے لیے حجت بن سکے۔ اس نسخہ کے علاوہ باقی نسخے صحابہ کرام رضؓ کے ذاتی نسخے تھے۔ ان میں ساتوں حروف کو یکجا کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق اپنا اپنا نسخہ تحریر کر رکھا تھا۔

اس طرح کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے کوئی قابلِ اعتماد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ ایسے نسخے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون سی

ت صحیح اور کون سی غلط ہے ۔ حضرت عثمان رضؓ نے یہی کارنامہ سرانجام دیا ۔ [۳۱]

گویا یہ اختلاف قرآنِ مجید کے متن یا اس میں کمی بیشی کا نہیں تھا بلکہ قرآن مجید کے بعض الفاظ کی ادائیگی
ا اور اگر بنظرِ حقیقت دیکھا جائے تو یہ اختلاف، دراصل اختلاف تھا ہی نہیں ۔ قرآن کے بعض الفاظ ایک
، زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت تو خود اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھی ۔ [۳۲]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید کے جمع و تدوین کا کام حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے عہدِ خلافت
انجام پاچکا تھا تو حضرت عثمان رضؓ کے کام کی نوعیت کیا تھی ؟ علامہ جلال الدین سیوطی نے ابن تین اور
علماء کا نقطۂ نگاہ نقل کیا ہے کہ :

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ کے قرآنِ مجید جمع کرنے کا فرق یہ ہے کہ خلیفۂ اوّل نے یہ کام
، خوف سے کیا تھا کہ کہیں حاملینِ قرآن کی موت کے ساتھ قرآن کا بھی کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے کیونکہ قرآن
وقت ایک جگہ اکٹھا نہیں تھا ۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کو صحیفوں میں اس ترتیب سے جمع کیا کہ ہر ایک سورت
آیات حضور اکرم صلعم کے حکم کے مطابق درج کر دیں اور حضرت عثمان رضؓ کے جمع کرنے کی یہ شکل تھی کہ جس
ت قرآن کی تلاوت کے انداز اور طریقہ میں اختلاف زیادہ ہو گیا اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ قرآن
اپنی زبان میں پڑھنے لگے ، اور ظاہر ہے کہ عرب کی زبانیں بہت وسیع ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں
سے ہر ایک لہجے کے لوگ دوسرے لہجے والوں کو برسرِ عام غلط کہنے لگے اور بات بڑھ جانے اور مشکلات
ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا ۔ اس لیے حضرت عثمان رضؓ نے قرآن کو ایک ہی مصحف میں سورتوں کی ترتیب
ساتھ جمع کر دیا اور تمام عرب کی زبانوں کو چھوڑ کر محض قبیلہ قریش کی زبان پر اکتفا کر لیا ۔ اس سلسلے میں
کی دلیل یہ تھی کہ قرآن ، زبانِ قریش میں نازل ہوا ہے ۔ صرف ابتداء میں دقت سے بچنے کے لیے اس کی
ت قریش کے علاوہ دوسری زبانوں کے تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی ۔ حضرت عثمان رضؓ
ائے یہ تھی کہ جس ضرورت کے تحت یہ اجازت دی گئی تھی وہ ضرورت اب ختم ہو چکی ہے ۔ لہٰذا انہوں نے
کی قرآت محض ایک ہی زبان میں منحصر کر دی ۔ [۳۳]

اس سلسلے میں علامہ سیوطیؒ نے قاضی ابوبکر کا ایک بیان نقل کیا ہے ۔

حضرت عثمان رضؓ نے حضرت ابوبکر رضؓ کی طرح قرآن کو محض بین اللوحین ہی جمع کر دینے کا ارادہ نہیں فرمایا
ہوں نے تمام مسلمانوں کو ان معروف اور ثابت قرأتوں پر جمع کر دینے کا ارادہ کیا جو نبی اکرم صلعم سے منقول
آ رہی تھیں اور جس قدر قرأتیں اس کے علاوہ پیدا ہو گئی تھیں انہیں مٹا دینا چاہا ۔ [۳۴]

علامہ سیوطیؒ نے حارث محاسبی کا نقطۂ نگاہ نقل کیا ہے کہ ۔

حضرت عثمان رضؓ نے تو یہ کیا کہ اپنے اور اپنے پاس موجود مہاجرین و انصار کے اتفاق رائے سے لوگو
ایک ہی قرأت پر آمادہ کر لیا۔ ۱۷ھ

حضرت عثمان رضؓ نے درحقیقت ایک ایسا رسم الخط اختیار فرمایا جس میں ثابت شدہ تمام قرأتیں سما
نفیں۔ گویا انہوں نے قرآن کے الفاظ و حروف کی تعداد، آیات و سوَر کی ترتیب و تعداد میں ایسی کوئی تبدیلی
کی جس سے قرآن کے متن میں کوئی کمی بیشی ہوئی ہو۔ ان کے رسم الخط میں نہ نقطے لگائے گئے نہ حرکات، مثا
سورۃ البقرہ میں سرہا لکھا تاکہ اسے نَنشُرُہا اور نُنشِزُہا، دونوں طرح پڑھا جاسکے۔ کیونکہ یہ دونوں قرأ
درست ہیں۔ اسی طرح سورۃ الحجرات میں فَتَبَیَّنُوا کو فَتَبَیَّنُوا بھی پڑھا گیا اور فَتَثَبَّتُوا بھی۔ حضرت عثم
نے اسے "فتبینو" لکھا تاکہ دونوں طرح پڑھا جا سکے۔ ۱۸ھ

اس طرح حضرت عثمان رضؓ کا مقصد "سات حروف" کو ختم کرنا نہ تھا بلکہ انہوں نے تو انہیں ہمیشہ
لیے محفوظ کر لیا۔ یہ نقطۂ نگاہ علامہ ابن حزم نے الفصل فی الملل میں ۱۹ھ مولانا عبدالحق حقانی نے مقدمہ تف
حقانی میں ۲۰ھ علامہ زرقانی نے مناہل العرفان ۲۱ھ میں بیان کیا ہے آپ نے درحقیقت ایسا رسم
اختیار فرمایا کہ اس کی موجودگی میں تمام قرأتوں والے اپنے اپنے انداز کے مطابق پڑھ سکیں۔

علامہ جزری لکھتے ہیں۔

فقہاء، قراء اور متکلمین کی جماعتوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساتوں حروف
پر مشتمل ہیں۔" ۲۲ھ

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں۔

واما قول من قال ابطل الاحرف	رہا یہ قول کہ حضرت عثمان رضؓ نے "چھ حروف"
الستة فقد كذب من قال ذلك	کو منسوخ کر دیا تو جس نے یہ بات کہی ہے
ولو فعل عثمان ذلك او اراده لخرج	اس نے بالکل غلط کہا ہے۔ اگر آپؓ ایسا
عن الاسلام ولما مطل ساعة	کرتے یا ایسا کرنے کا ارادہ کرتے تو ایک
بل الاحرف السبعة كلها موجودة	ساعت کے توقف کے بغیر اسلام سے خارج
عندنا قائمة كما كانت مثبوتة	ہو جاتے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں کے سات
فى القرأت المشهورة المأ	حروف ہمارے پاس بعینہ موجود و مشہور اور
ثورة "۲۳ھ	قرأتوں میں محفوظ ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی، امام ابوالحسن علی اشعری کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

واقعہ یہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ قرأت میں موجود ہیں [۲۴] علامہ زرکشی نے قاضی ابوبکر کا قول ل کیا ہے کہ۔

الصحیح ان ھٰذہ الاحرف السبعۃ ظہرت واستفاضت عن رسول اللہ صلعم وضبطھا عنہ الائمۃ واثبتھا عثمان والصحابۃ فی المصحف [۲۵]	صحیح بات یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف حضور اکرم صلعم سے شہرت کے ساتھ منقول ہیں ائمہ نے انہیں محفوظ رکھا ہے اور حضرت عثمانؓ اور صحابہ کرام نے انہیں مصحف میں باقی رکھا۔

ان حضراتِ گرامی کے علاوہ علامہ علی القاری [۲۶]، علامہ زرقانی [۲۷]، شاہ ولی اللہ [۲۸]، علامہ انور شاہ یری [۲۹]، علامہ زاہد الکوثری [۳۰] نے اسی نقطۂ نگاہ کا اظہار کیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، ابن جریر ء اس خیال کو کہ مصحفِ عثمانؓ میں "سات حروف" ختم کر دیئے گئے، درست تسلیم نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں راصل علامہ ابن جریر طبری پر "سبعہ احرف" کے صحیح معانی واضح نہیں ہو سکتے۔ [۳۱]

اس سلسلے میں علامہ زاہد الکوثری لکھتے ہیں۔

"بہت سے لوگوں نے ابن جریر طبری کے مقام سے متاثر ہو کر یہ رائے قائم کر لی ہے کہ اس وقت رآنِ مجید صرف ایک ہی حرف پر موجود ہے...... ابن جریر کی رائے نہایت سنگین اور خطرناک ہے" [۳۲]

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید جلا ڈالا، اس بارے میں بعض لوگوں ء یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ لیکن اسے ایک امر واقع بھی مان لیا جائے تو یہ کارروائی ت ناگزیر تھی۔ کیونکہ قرأت کے اختلاف کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے اور ایک دوسرے کا فر قرار دے رہے تھے اگر سرکاری اور متفقہ نسخے کے علاوہ باقی نسخے باقی رکھے جاتے تو حضرت عثمانؓ کی ساری منت ضائع ہو جاتی اور لوگ اسی طرح اختلافات کا شکار رہتے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس نسخے کو متفقہ نے کے طور پر متعارف کروایا جاتا جو باقی نسخوں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ پھر یہ کہ اس کارروائی سے قرآنِ مجید کے ب شوشے پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا اس لیے کہ قرآنِ مجید لوگوں کے سینوں میں موجود تھا۔ اس صورت میں کسی ز کے ضائع ہونے کا امکان نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر آپ کا مقصد یہی ہوتا کہ آپ کے نسخہ کو چیلنج سے بچایا جائے تو آپ کبھی بھی حضرت حفصہؓ کا نسخہ ہیں واپس نہ کرتے اور یہ سرکاری تحویل میں آجاتا۔ حضرت حفصہؓ کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ اس بات کا راز موجود تھا کہ آپ امت کے اجتماعی مفاد کا حوالہ دے کر اس نسخہ کو اپنے ہی پاس رکھ لیتے یہ نسخہ ۱۴ ہجری

سے لے کر ۶۴ یا ۶۵ ہجری تک موجود رہا ۔

اس نسخے کی موجودگی میں حضرت حفصہ رضؓ اور دیگر حفاظِ کرام کسی بھی طرح کا تصرف برداشت نہیں کر۔
تھے ۔ اس پورے عرصے میں ہمیں کہیں سے بھی ایک آواز بلند ہوتی ہوئی سنائی نہیں دیتی کہ حضرت عثمان رضؓ نے
مجید کے نسخے جلا دیئے ۔

یہ بات عملاً بھی ناممکن تھی کہ حضرت عثمان رضؓ کی پولیس آناً فاناً پوری مملکت میں حرکت میں آگئی ہو او
تے تمام لوگوں سے جبراً قرآن مجید برآمد کروا کے جلا دیئے ہوں ۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ ایسا ہوا اور نہ ایسا ممکن
باقی مصاحف کے جلا دیئے جانے کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوتے علامہ زرکشی لکھتے ہیں ۔

واما تعلق الروافض بأن
عثمان احرق المصاحف
فانه جهل منهم وعمى فان
هذا من فضائله وعلمه،
فانه اصلح ولمّ الشعث
وكان ذالك واجبًا عليه، ولو
تركه لعصى، لما فيه من التضييع
وحاشاه من ذالك ۔
واما قولهم: انه احرق
المصاحف، فانه غير ثابت
ولو ثبت لوجب حمله على
انه احرق مصاحف قد اودعت
مالا يحل قراءته وفي الجملة
انه امام عدل غير معاند ولا
طاغ في التنزيل، ولم يحرق
الا ما يجب احراقه
ولهذا لم ينكر عليه
ذالك، بل رضوه وعدّوه

جہاں تک روافض کی اس بات کا تعلق ہے کہ
حضرت عثمان رضؓ نے مصاحف کو جلا دیا تھا تو یہ انکی
جہالت اور اندھا پن (حقائق سے آنکھیں بند کر لینا
ہے یہ تو ان کے فضائل اور علم میں شمار ہوتا ہے
بے شک انہوں نے یہ اچھا کارنامہ انجام دیا کہ
بگاڑ کی اصلاح کر دی اور یہ کام (بحیثیت
خلیفہ) ان پر لازم تھا ۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے
تو یہ غلط کام ہوتا ۔ کیونکہ (اس صورتِ حال میں)
قرآنِ مجید کے ضائع ہو جانے کا خدشہ تھا اور
وہ اس سے بچنا چاہتے تھے ۔
اور ان کا یہ قول کہ حضرت عثمان رضؓ نے قرآنی
مصاحف جلا ڈالے تھے، ثابت نہیں ہے اور
اگر یہ ثابت ہو بھی جائے تب بھی ہم اس فعل
کو اسی پر محمول کریں گے کہ انہوں نے ان ہی مصاحف
کو جلایا جن میں ایسی قرأتیں موجود تھیں جن
کا پڑھنا جائز نہ تھا ۔ مختصر یہ کہ حضرت عثمان رضؓ
امام عادل تھے، حق یا قرآن کے مخالف نہ
تھے اور تنزیل کے بھی مخالف نہ تھے ۔ انہوں

من مناقبه، حتی قال علیؓ، لو ولیت ما ولی عثمان لعملت بالمصاحف ما عمل۔

نے اسی چیز کو جلایا جس کا جلانا ان پر واجب تھا۔ اسی لیے کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ اس سلسلے میں سب متفق ہوئے اور جمع قرآن کو سب نے ان کے مناقب میں شمار کیا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے فرمایا اگر مجھے عثمان کی طرح والی بنایا جاتا تو مصاحف میں وہی کچھ کرتا جو عثمان نے کیا۔

جہاں تک جمع قرآن کمیٹی کے ارکان کی تعداد میں فرق والی روایات کا تعلق ہے، ان میں ابن ابی داؤد کی بیان کردہ ایک روایت میں ارکان کی تعداد بارہ [۳۳] اور بخاری کی روایت کے مطابق چار ہے۔[۳۴] بعض مستشرقین نے بھی اس اختلاف کو اچھالا ہے اور حضرت عثمانؓ کی جمع قرآن کی کارروائی کو انہوں نے متن قرآن کو مشکوک بنانے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔[۳۵]

جب ہم ابن ابی داؤد کی بیان کردہ روایات کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس موضوع سے متعلق تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے انہیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ ان روایات میں سے کونسی روایت غلط ہے کون سی ضعیف اور کون سی معتبر۔ چنانچہ وہ ایک طرف اگر بارہ رکنی کمیٹی کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی دو رکنی کمیٹی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صبحی صالح لکھتے ہیں۔ "عجیب بات ہے کہ ابن ابی داؤد ایک ہی مسئلہ کے بارے میں مختلف روایات نقل کرنے کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان میں واضح طور پر تضاد ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو"۔[۳۶]

اس کے علاوہ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ بخاری شریف، قرآن مجید کے بعد معتبر ترین کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ وہ کتب احادیث کے طبقات میں طبقہ اوّل میں سر فہرست ہے۔ جب کہ ابن ابی داؤد کی "کتاب المصاحف" تیسرے یا چوتھے درجہ کی کتاب ہے۔ ابن ابی داؤد بطور محدث اور ان کی کتاب (المصاحف) وہ مقام نہیں رکھتے جو بخاری اور ان کی الجامع الصحیح کو حاصل ہے۔ اس لیے عقلی اور اصولی طور پر بخاری کی روایت زیادہ معتبر ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ان متناقض روایات کا جائزہ لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ کام چار اصحابؓ کے ہی سپرد تھا لیکن دیگر صحابہ کرامؓ کو ان کی مدد پر مامور کیا گیا تھا۔ ان اصحابؓ میں حضرات ابی ابن کعبؓ، کثیر بن افلح مالک بن ابی عامر۔ انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ تھے۔[۳۷]

حضرت عثمان رضؓ نے اس کام کے شروع کرنے سے پہلے اکابر صحابہ رضؓ کو جمع فرمایا اور ان سے مشورہ کیا۔ "مجھے یہ خبر ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے کو اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے لہٰذا اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ صحابہ کرام رضؓ نے ان سے پوچھا، آپ نے کیا سوچا ہے؟ آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کردیں تاکہ کوئی اختلاف و انتشار پیش نہ آئے۔ صحابہ کرام رضؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور حضرت عثمان رضؓ کی تائید کی۔" [۳۸]

حضرت عثمان رضؓ والے نسخہ پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہوا تھا۔ علامہ مقری اپنی کتاب نفح الطیب میں لکھتے ہیں۔

ھذا ما جمع علیہ جماعۃ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھم زید بن ثابت و عبداللہ بن زبیر و سعید بن العاص [۳۹]	یہ وہ مصحف ہے جس پر اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت نے اجماع فرمایا تھا۔ ان صحابہ کرام رضؓ میں زید بن ثابت عبداللہ بن زبیر اور سعید بن العاص ہیں۔ [۳۹]

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں ایک مصحف تیار کیا گیا۔ اس میں شاذ قرأتوں کو چھوڑ دیا گیا صرف متواتر قرأتوں کو لیا گیا اور قبائلِ عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل کیا گیا تھا۔ ایک لغتِ قریش کو (رسم الخط میں) اختیار کرلیا گیا اور باقی لغات کے مصاحف ترک کردیئے گئے۔

ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف میں یہ روایت موجود ہے کہ

حضرت علی رضؓ نے فرمایا حضرت عثمان رضؓ کے بارے میں بھلائی کے علاوہ کوئی بات نہ کہو۔ کیونکہ مصاحف کے بارے میں انہوں نے جو کیا وہ ہماری موجودگی میں کیا۔ انہوں نے ہم سب سے مشورہ کیا کہ ان قرأتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے۔ حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کفر کے قریب تک پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے ان سے کہا کہ پھر آپ کی رائے کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کردیں تاکہ کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے۔ ہم سب نے کہا آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی۔ [۴۰]

سطور سابقہ میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں ان سے یہ باتیں واضح ہو رہی ہیں کہ

۱۔ حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں جو کارروائی ہوئی وہ بلا جواز نہ تھی۔ اس کی ضرورت دینی اعتبار سے بھی تھی اور عقل اور منطق بھی اس کی متقاضی تھی۔

یہ کام آپ نے صرف اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ صحابہ رضؓ کا مشورہ بھی اس میں شامل تھا۔
جس چیز کو اختلاف کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت دراصل اسی قدر تھی کہ کچھ الفاظ کی ادائیگی میں فرق
د تھا۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مولانا تقی عثمانی، مستدرک حاکم کے
ے سے لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضؓ نے جو نسخہ تیار کروایا تھا اس میں سورتیں مرتب نہ تھیں بلکہ ہر سورت
ے الگ لکھی ہوئی تھی۔ اب حضرت عثمان کے دور میں ترتیب توقیفی کی بنیاد پر انہیں ترتیب دے کر
ے مصحف میں یکجا کر دیا گیا۔ ۲ ؎
حضرت عثمان رضؓ کے جمع کردہ قرآن مجید میں ایسا رسم الخط اپنایا گیا تھا جس میں تمام منسوب تک
ہے۔
۳۔ حضرت علی رضؓ کا دورِ حکومت مصحف عثمانی کی ترتیب کے بعد ہے۔ سربراہ مملکت ہونے، حافظِ قرآن
نے اور محافظِ دین (خلیفہ) ہونے کے ناطے آپ پر فرضِ عین تھا کہ آپ تحریف شدہ مقامات کے
ح فرماتے جب کہ ایسا نہیں ہوا۔
آپ کا خاموش رہنا ایک دینی جرم ہوتا۔ کیا کوئی ادنیٰ مسلمان بھی اس کا تصور کر سکتا ہے کہ اس مرتبہ
پر فائز ہوتے ہوئے آپ نے قرآنِ مجید کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیا۔ ان تمام باتوں کے بالمقابل
نے نہ صرف کسی قسم کی تحریف کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ آپ نے وہی قرآن امت کو دیا جو حضرت عثمان رضؓ نے مرتب
یا تھا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں۔
حضرت علی رضؓ۔۔۔ پونے چھ برس تک برسرِ اقتدار رہے۔ ان کا حکم چلتا تھا۔ ان پر کیا دباؤ تھا کہ انہوں
صل قرآن جاری نہیں فرمایا۔ امام حسن کو بھی خلافت ملی۔ وہ بھی امام معصوم سمجھے گئے ہیں۔ ان سب
کے باوجود کسی کو یہ کس طرح جرأت ہو سکتی ہے کہ ایسی بات کہے۔۔۔۔ قرآن میں کوئی حرف زائد یا کم یا تبدیل
ا ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں جبکہ قرآن میں تبدیلی کی وجہ سے ان حضرات پر جہاد، اہل شام سے لڑائی سے
دہ اہم اور ضروری تھا ۲۵ ؎
علامہ موصوف اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں۔
حضرت عثمان رضؓ ایسے وقت میں ہوئے ہیں کہ تمام جزیرۃ العرب مسلمانوں، قرآن مجید کے نسخوں، مساجد
قاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ قرآء حضرات بچوں بڑوں اور دور و نزدیک کے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے
۔ یمن جو ایک وسیع علاقہ تھا، بحرین، عمان جن کی آبادی وسیع اور متعدد دیہاتوں اور شہروں پر مشتمل تھی

مکہ طائف، مدینہ، شام، جزیرہ، مصر، کوفہ، بصرہ، ان تمام مقامات پر قرآن کے اس قدر نسخے اور قاری موجود کہ ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا۔ اگر حضرت عثمانؓ اس طرح کا ارادہ کرتے، جیسا کہ لوگ بیان کرتے ہیں تو بھی وہ ایسا کرنے پر ہرگز قادر نہیں ہوسکتے تھے ...... قرآنِ مجید کے لاتعداد نسخوں کو ختم سکنے کی بات تو بہت بڑی ہے اگر کوئی نابغہ یا زہیر کے شعر میں کوئی کلمہ گھٹانا بڑھانا چاہے تو جائز اور ثابت شدہ قرأتیں سماسکیں ۔[۴۳]

اس کے علاوہ اب تک قرآنِ مجید کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو، صرف ایک تھا۔ اب ایک سے زیادہ نقلیں کی گئیں۔ جو مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کو بھیجی گئیں اور ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا ۔[۴۴]

اس مصحف کی تیاری کے وقت نہ صرف یہ کہ حضرت حفصہؓ والے نسخہ کی ہو بہو نقل تیار کی گئی بلکہ مزید احتیاط کے لیے وہی طریقہ اپنایا گیا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنایا تھا، کہ عہدِ نبوی کی متفرق تحریریں طلب کی گئیں اور ان کا نئے مصحف سے از سرِ نو مقابلہ کیا گیا۔ حضرت زیدؓ نے اس وقت تک کوئی آیت نہ لکھی جب تک کہ وہ ان تحریروں میں بھی نہیں مل گئیں ۔[۴۵]

ان تمام احتیاطی تدابیر کی روشنی میں حضرت عثمانؓ کے تیار کردہ مصحف کی صحت کے بارے میں کسی بدگمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

بعض حلقوں کی جانب سے یہ نقطۂ نگاہ اختیار کیا گیا ہے کہ

حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید سے وہ تمام حصے نکال دیئے جن میں اہل بیت اور حضرت علیؓ کے مناقب و فضائل بیان کیے گئے تھے ۔[۴۶]

حضرت عثمانؓ کی جمع قرآن کی کارروائی کے بارے میں حضرت علیؓ کا نقطۂ نگاہ ابن ابی داؤد کے کتاب المصاحف کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے حضرت علیؓ کا وہ تفصیلی بیان بھی نقل کیا ہے جس سے درمصحف عثمانؓ کے بارے میں حضرت علیؓ کے نقطۂ نگاہ کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے ۔[۴۷]

اس نقطۂ نگاہ کے سلسلہ میں درج ذیل نکات بھی غور طلب ہیں۔

۱۔ کیا حضرت علیؓ کے سامنے قرآنِ مجید میں تبدیلی اور کمی کردی گئی اور آپؓ نے اس سلسلے میں کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ خاموش رہے۔

(جاری ہے)

پاکستان آرمی میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر خطیبوں کی ضرورت

پاکستان آرمی میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر خطیبوں کی خالی آسامیوں کو پُر کرنے کے لئے مطلوبہ قابلیت کے حامل حضرات سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

مطلوبہ قابلیت

ا۔ افواجِ پاکستان کے لئے منظور شدہ کسی دینی مدرسہ سے درس نظامی میں فراغت کی سند۔
ب۔ پاکستان کے کسی بورڈ سے کم از کم میٹرک کی سند۔
ج۔ روزمرہ امور کے متعلق عربی بول چال میں مہارت، قرأت اور حفظ اضافی قابلیت تصور کی جائے گی۔

عمر

یکم اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ۲۰ سال سے کم اور ۲۸ سال سے زائد نہ ہو۔

عہدہ اور تنخواہ

ملازمت کے لئے منتخب اُمیدواروں کو نائب خطیب (نائب صوبیدار) کا عہدہ دیا جائے گا۔ فوجی وردی کی بجائے منظور شدہ شہری لباس فوج کی طرف سے مُفت مہیا کیا جائے گا۔ فوج کے دیگر جونیئر کمیشنڈ افسروں کی طرح اگلے رینک میں ترقی کی گنجائش ہوگی۔

الاؤنسز و دیگر مراعات:

وہ تمام الاؤنسز و مراعات جو فوج کے جے سی او صاحبان کو حاصل ہیں، انہیں بھی حاصل ہونگی۔ مثلاً ذات کے لئے مفت راشن، مفت رہائش (جہاں مہیا ہو ورنہ کوارٹر الاؤنس) اپنے اور بیوی بچوں کیلئے مفت طبی سہولت، سفر کی مراعات، پنشن، گریجویٹی اور بیمہ کی مراعات وغیرہ وغیرہ۔

ملازمت کی جگہ:

پاکستان میں یا پاکستان سے باہر کسی جگہ۔

تربیت:

منتخب اُمیدواروں کو فوجی زندگی سے روشناس کرانے کی خاطر خاص تربیت دی جائے گی۔

طریق انتخاب:

ا۔ مختلف مقامات پر ابتدائی تحریری امتحان۔ ب۔ انٹرویو۔ ج۔ طبی معائنہ

درخواستیں مجوزہ فارم پر اصل اسناد کی تصدیق شدہ نقول کے ہمراہ شعبہ دینی تعلیمات آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ آئی جی ٹی اینڈای برانچ جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں **۱۵ جولائی ۱۹۹۶ء** تک پہنچ جانی چاہئیں۔

درخواستوں کے فارم مذکورہ شعبہ دینی تعلیمات سے ۲/۱ ۲ روپے کا جوابی ڈاک لفافہ بھیج کر حاصل کئے جاسکتے ہیں فارم طلب کرتے وقت اپنی قابلیت اور سند الفراغ کے بارے میں پوری معلومات لکھیں۔

پاکستان آرمی

خالد محمد غازی
ترجمہ: سید ولی حسن

نومسلم جرمن خاتون برتیا روز کے تاثرات

اسلام کے خاندانی نظام نے مجھے اعتماد عطا کیا اور امان دیا

پردہ ہی عورت کے عفت و پاک دامنی کا سرچشمہ ہے

مسلمان خاندان اپنے آپسی میل جول، بلند اخلاق قدروں اور اعمال روحانی پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ان سارے مغربی خاندانوں سے فائق و برتر ہے جہاں اخلاقی زوال اور بے راہ روی کا دور دورہ ہے یہ اور بات ہے کہ مسلم خاندانوں اور مغربی خاندانوں کے درمیان مادی وسائل کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے، مختلف شعبۂ زندگی میں مغرب زبردست ٹکنالوجی ترقی کی بنا پر آگے بڑھا ہوا ہے جس نے مغربی خاندانوں کے لیے زندگی میں کافی زیادہ راحت و آرام کے دروازے کھول دیئے ہیں مگر مغربی خاندان روحانی سکون و اقدار اور آپس میں تعلقات و میل جول کی کمی شدت سے محسوس کرتا ہے انہی چیزوں کی بنا پر مسلم خاندان کو برتری حاصل ہے یہی اقدار، آپسی تعلقات اور روحانیت مسلم خاندان کو اطمینان اور نفسانی و روحانی سکون بخشتے ہیں اور اسے دوسرے خاندانوں سے ممتاز کرتے ہیں اور انہی چیزوں نے مجھے اسلام کی طرف کھینچا۔

اپنی اس رائے کا اظہار جرمن خاتون برتیا روز نے اس وقت کیا جب ہماری ان سے ملاقات جامعہ ازہر میں ہوئی جہاں وہ اپنے اسلام کے اعلان کے لیے آئی ہوئی تھیں۔

انہوں نے مزید کہا، میرا بھی وہی حال تھا جو عام یورپین عورتوں کا ہے کہ ہم برابر کلیسہ نہیں جاتے تھے اور نہ ہی کسی نئے دین کی تلاش و جستجو کرتے تھے، لیکن میں خود اندرونی کرب محسوس کرتی تھی، میں کسی ایسے خاندانی نظام کی متلاشی تھی جو مغرب کے عائلی نظام سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہو۔ یہ سوچ و فکر میرے اندر کئی سالوں سے بلکہ بچپن ہی سے پیدا ہوگئی تھی، یہ سوچ و فکر میرے اندر بڑھتی رہی اور نشو و نما پاتی رہی یہاں تک کہ میرا تعارف پورٹ سعید کے ایک مصری مسلم خاندان سے ہوگیا میں نے ان کے ساتھ کچھ وقت گذارا میں پورٹ سعید میں ان کے درمیان خاندان کے فرد کی طرح رہی، پورے خاندان والوں نے میرے ساتھ محبت تعلق کا معاملہ رکھا۔ میں نے ماں کو ایسا محسوس کیا گویا وہ میری سگی ماں ہیں۔ ان کے بیٹوں کو ایسا محسوس کیا گویا وہ میرے سگے بھائی ہیں۔ ان کے درمیان رہ کر میں اپنے آپ کو واقعی مسلمان تصور کرنے لگی۔

ماں مجھے اسلامی تعلیمات سے واقف کراتی ہیں خاندان والے میرے ساتھ حسن سلوک اور محبت کے ساتھ پیش آتے رہے جیسے ان کی ہر حرکت، ہر بات، ہر معاملہ یہ کہہ رہا ہو کہ اسلام ایک فائق اور پرکشش مذہب ہے۔

دوسری جانب میں خاندانی نظام پر غور کرنے لگی جسے میں پوری زندگی تلاش کرتی رہی تھی اور جسے میں نے اس مسلم خاندان میں پا لیا تھا، احترام محبت، پائیداری، فضائل پر عمل کرنے کی حرص، آزادی میں حدود، نرمی وشائستگی غرض کیا نہیں تھا اس خاندان میں۔ اس خاندان کے ایک فرد نے مجھے شادی کا پیغام دیا تو پورے خاندان والوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی، حالانکہ میں ان کے دین پر نہیں تھی میں نے بھی حامی بھر لی اور ان سے میرے تعلقات و میل جول زیادہ ہوتے گئے اور میں باضابطہ طور پر اس خاندان کی ایک فرد بن گئی۔

ایک رات پورٹ سعید کی پرسکون اور خوبصورت فضا میں تنہا بیٹھی کافی دیر تک اس خاندان کے ماحول کے بارے میں سوچتی رہی اور یقین کر لیا کہ اس خاندان کی خوبصورت ہم آہنگی اور آپسی تعلقات کا راز اسلام ہی ہے اسی سوچ نے مجھے اپنے اسلام کے اعلان کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔

میں ماں کے پاس آئی اور جو کچھ میرے دماغ میں گھوم رہا تھا اور جو کچھ میں نے سوچا تھا ان کو بتایا ماں نے خوش آمدید کہا اور جب میں نے اسلام میں داخل ہونے کا طریقہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہو "أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمد رسول الله" میں نے کلمہ پڑھ لیا اس کے بعد وہ مجھے نماز کی تعلیم دینے لگیں اور قرآن پڑھانے لگیں، پھر مجھ سے کہا اسلام کا اعلان ضروری ہے اس کے لیے ازہر جاکر رجسٹریشن کرانا چاہیئے۔

میں نے ازہر شریف میں وہاں کے علماء کے سامنے کلمہ شہادت پڑھا اور میرا نام فاطمہ رکھا گیا میری نظر میں یہ نام دو سبب سے بہترین نام ہے ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول کی بیٹی کا نام ہے، دوسرے اس محترم خاتون کا نام ہے جنہوں نے اپنے گھر میں میری مہمان نوازی کی، مجھے بتایا کہ میں کس طرح مسلمان ہوں اور اس وقت جبکہ میں نے جرمنی کی زندگی ترک کردی تھی۔ خاندانی فرحت و سرور بخشا، اور مصر میں ان کے ساتھ زندگی گزاری۔

جرمن خاتون نے کہا: مسلمان کبر و نخوت کے بجائے نرمیٔ قلب اور بہترین اخلاق سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ چیز ان کے علاوہ میں نے کسی اور دوسرے کے اندر نہیں پائی اس وجہ سے اب میں مسلم ماحول میں رہوں گی۔ اور اب پردہ اور عفت و طہارت کا پورا پورا احترام کروں گی، پردہ و حجاب میں مجھے عورت کے حسن و جمال اور اس کی پاکدامنی و عفت کا سرچشمہ نظر آتا ہے۔

انہوں نے اپنی حکایت کا اختتام اپنی اس بات پر کیا کہ اب میں فقط ایک آپس میں محبت کرنے والے، میل جول رکھنے والے پائیدار و مضبوط مسلم خاندان کی طرف نسبت کرتی ہوں اور بس اللہ مجھے اس پر قائم رکھے اور اپنے دین کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے اور مجھے دوسروں کے لیے نمونہ بنائے۔ (اخبار العالم الاسلامی مکۃ مکرمہ)

The First Name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

Sohrab, the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort... absolutely the last word in bicycles.
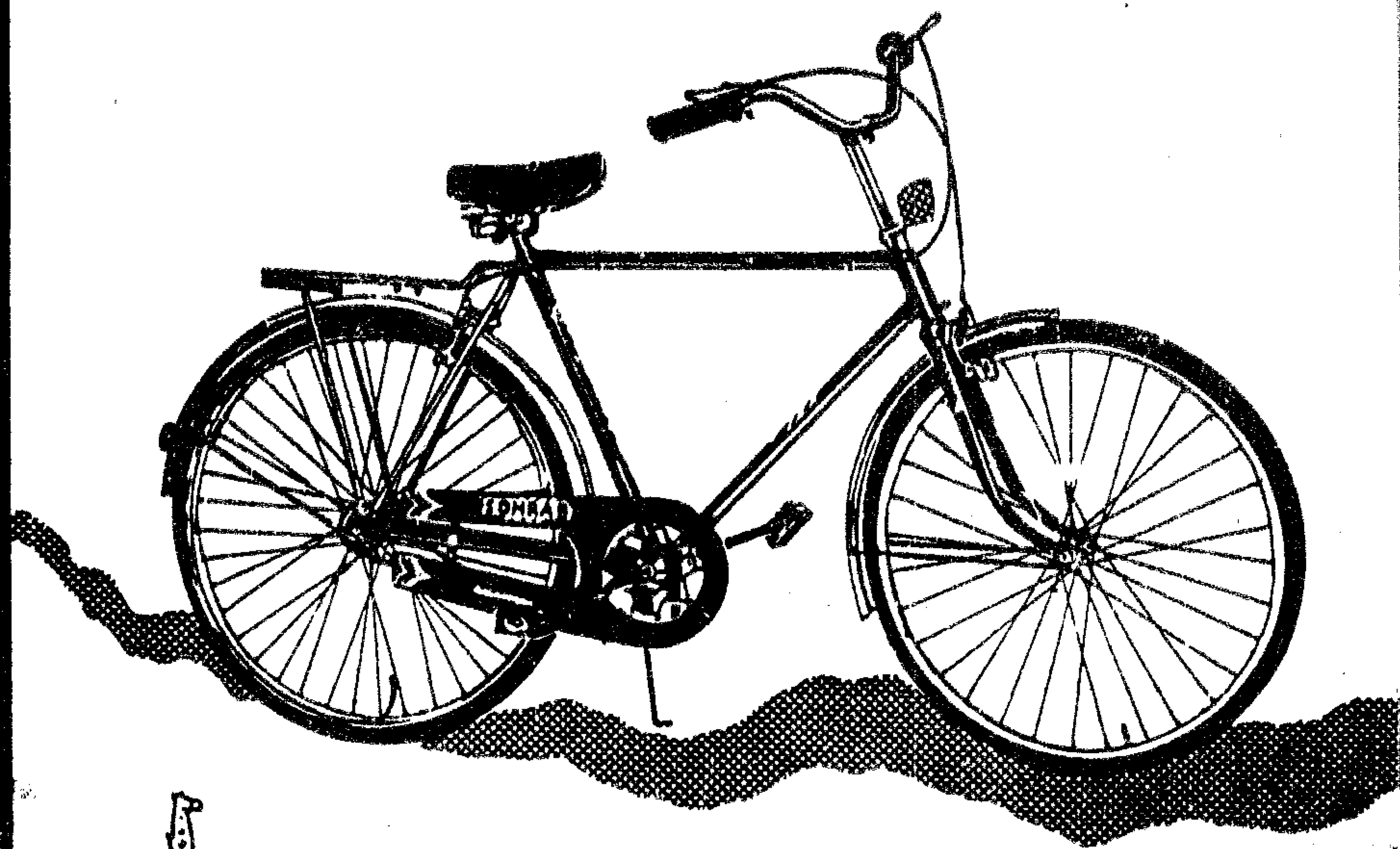
PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Lahore, Pakistan.
Tel: 7321026-8 (3 Lines). Telex: 44742 CYCLE PK. Fax: 7235143. Cable: BIKE

مطالعہ اور عمل

ایک فعال نصاب تعلیم کا مطالعہ

خوش قسمتی سے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا وہ خطاب نظر سے گذرا جو طلبا میں دعوتی مزاج
[تشک]یل کے بارے میں تھا۔ اس تقریر کو پڑھ کر میں پھڑک اٹھا کیونکہ محترم نے نئے تعلیمی فلسفہ کو روحانی قالب
[میں] ڈھال کر پیش کیا۔ درحقیقت مطالعہ اور عمل کا تعلیمی کردار اسلاف سے چلا آرہا ہے مگر حالیہ دور میں اس کو نئے
[ٹ]یکنیکی انداز سے پیش کیا جارہا ہے۔ دوران کلام مولانا نے ارشاد فرمایا۔ "ہم یہاں آپ کو ایک حقیقت سے
[آگاہ] کرنا چاہتے ہیں کہ ایک چیز ہوتی ہے فیکٹر (FACTOR) دوسری چیز ہوتی ہے ایکٹر (ACTOR) عام طور پر
[سمجھ]ا لیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں صرف اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اثر ڈالنے کی نہیں۔ لیکن عرصہ سے ہمارا تعلیمی
[نظا]م چاہے مدارس عربیہ کا ہو یا انگریزی اسکولوں کا اسی غلط فہمی کا شکار رہے، مغرب نے اپنے بچوں کو عمل کرنا
[سکھ]لانا اور مطالعہ میں ڈوب جانا سکھایا اس لیے وہ تعلیمی دنیا کے صف اوّل میں داخل ہوگئے۔ اس کے برخلاف
آزادی کے بعد قیود علم و عمل سے بھی آزاد ہوگئے۔

میں چند مثالیں پیش کررہا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کو اوائل عمر سے ہی مطالعہ
[و ع]مل کے میدان میں کس طرح داخل کیا جاتا ہے۔ اور یہاں ہمارے بچے ابھی کتنا پیچھے ہیں۔

[انفر]ادی مطالعہ:۔ برٹش اسکول کی ایک لڑکی کو میں نے دیکھا جو سینئر کیمبرج (SENIAR CAM-
BRI[DGE]) کا امتحان دینے والی تھی اس کے پاس تقریباً سو کتابوں کی لائبریری تھی کتابیں متنوع عنوانات پر
[تھیں] یہاں تک کہ ایک کتاب ۲ ہزار پہیلیوں کی بھی تھی اپنے یوم پیدائش کے تحفوں میں کتابیں ہی لینا پسند کرتی
[تھی] امتحان کا نتیجہ آیا تو اس کا اعلان تھا جتنے بھی مضامین تھے سب میں ڈسٹنکشن (DISTINCTION)
[او]ر ایک مضمون میں اس کا اسکور (SCORE) سو فیصدی تھا۔

اس درجہ کے طلبا کو وہاں ریسرچ پروجکٹ (تحقیقی مقالہ نویسی) دیتے جاتے ہیں۔ ایسے پروجکٹ جو زندگی
[س]ے بہت قریب ہوں، اسی لڑکی کے پاس ایک پروجکٹ پارکنگ لاٹ میں آنے والی کاروں کے بارے میں تھا۔

میں نے جب اس پروجیکٹ کا خاکہ دیکھا جو لڑکی نے تیار کیا تھا تو میں حیرت میں پڑ گیا، کیونکہ میں نے تو ایسا خاکہ اس وقت تیار کیا تھا جب میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ریسرچ پروگرامس کا ایک پروجیکٹ کر رہا تھا۔ اس وقت میں پرنسپل ہو چکا تھا۔

ایک واقعہ: میرے ایک ساتھی انگریزی کے ایم اے تھے اور پڑھتے بہت تھے انگریزی لٹریچر پر ان کو بڑا عبور تھا۔ آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے انٹرویو الہ آباد میں ہوا ایک انگریز ٹنکر (TINKER) نامی چیئرمین تھا۔ ان کو انگریزی لٹریچر کا ایم اے دیکھ کر سوالات کی بھر مار کر دی اور جو جواب یہ دیتے اس کو غلط کہہ اور اس کی تنقیص کرتا لیکن انہیں اپنے مطالعہ پر اعتماد تھا اس لیے مرعوب نہیں ہوتے اور اپنے جواب کے حق میں دلائل پیش کرتے رہے ...... آخر میں اس نے جھنجھلا کر کہا کہ ایسے نامعقول جوابات میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ انٹرویو ختم ہو گیا۔ واپس آئے تو ان کا منہ لٹکا ہوا تھا کہنے لگے کہ ٹنکر سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے میرے دلائل کو نہیں مانا اور جھلا گیا لیکن جب نتیجہ آیا تو ان کا نام کامیابوں کی فہرست میں تھا اور معلوم ہوا کہ انٹرویو میں ان کو دو سو نمبر میں دو سو ۲۰۰ نمبر ملے تھے مطالعہ پر اعتماد کی یہ ایک زندہ مثال ہے۔

مطالعہ استاد کا حق ہے: کسی وقت الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں ایک سیمنار ہو رہا تھا اس میں امریکہ کسی پرائمری اسکول کا ایک ٹیچر شریک تھا۔ وہ تھا تو عمرانیات کا طالب علم مگر سائنس، فلسفہ، تواریخ، لٹریچر وغیرہ ایسے وثوق سے بولتا تھا کہ ہمارے یہاں ماہرین اساتذہ بھی حیرت زدہ ہو گئے اس کے برخلاف ہمارا استاد تو اپنے مضمون پر بھی اعتماد اور وثوق سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ وہ بیچارہ تو اسی دن سے تارک مطالعہ ہو جاتا ہے جس دن سے ملازمت کا پروانہ اس کو ملتا ہے اور ہمارے پرائمری اسکول کا استاد تو اپنے مضامین سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ اخبار تک پڑھنا اسے گوارا نہیں ہے۔

ایک مطالعہ کا ذوق: امریکی اسکولوں میں بچوں کو کتب بینی کا بہت ذوق پیدا کیا جاتا ہے ایک لڑکی جو درجہ گیارہ میں پڑھ رہی تھی، ہر روز ایک گھنٹے کے لیے محلہ کی پبلک لائبریری میں جاتی تھی کیونکہ اسے جن موضوعات پر مضامین تیار کرنا تھا اس کے لیے لائبریری کا سفر ضروری تھا پھر اس کو ہفتہ میں ایک دن کتابوں کو تقسیم (SHE... کرنے کا کام بھی دیا جاتا تھا تاکہ اس کی نظر لائبریری کی بہت سی کتابوں پر پڑ جائے وہاں ان تجربات کے مارکس (MRIT) لانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

ذوق تجسس: امریکہ میں چھوٹی ہی عمر سے بچوں کو تفکر کا عادی بناتے ہیں ایک خاتون ٹیچر نے اسلامک سنڈے کے بچوں کے سامنے قرآن پاک کا یہ حکم رکھا کہ اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔ پھر بچوں سے کہا کہ تم خود بتاؤ کہ کیوں ڈرنا چاہیئے، بچوں نے طرح طرح جوابات دیئے، مگر ایک بچے نے جو جواب دیا وہ قابلِ تحسین ہے اس نے کہا

"میں اپنے والدین سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ اگر وہ ناراض ہو گئے تو مجھے چاکلیٹ لا کر کون دے گا اور اللہ سے میں اس لیے ڈرتا ہوں کہ اگر اللہ ناراض ہو گئے تو یہ اچھی اچھی چیزیں جو مل رہی ہیں کون دے گا"

ایک بار انگلستان کی تعلیم یافتہ ایک خاتون نے کہا کہ "میرا چار سالہ بچہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کہاں ہے؟ مجھے دکھلایئے میں اسے کیا جواب دوں میری سمجھ میں نہیں آتا"۔ اس وقت مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آگیا ؎

ما ترا جوئیم و تو از دیدہ دور
نے غلط ما کور و تو اندر حضور

تو میں نے بچے کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ "بیٹے! کیا تم اپنی ناک کو دیکھ رہے ہو؟" جواب ملا نہیں۔ پھر میں نے اسے ایک بہت دور کی جگہ کا اشارہ کرکے پوچھا "کیا تم اسے دیکھ رہے ہو؟" جواب ملا نہیں تو اب سمجھ لو میں نے کہا کہ اللہ تمھاری آنکھوں سے اتنے قریب ہیں کہ ان کو دیکھنا ناممکن ہے، اور تم سے اتنی دور ہیں کہ اس دوری تک ابھی تمھاری نظر نہیں دیکھ سکتی۔ اس لیے تم اللہ کو دیکھ نہیں سکتے۔ مگر ہیں وہ تمھاری آنکھ میں موجود ہے۔

ایک بار ہوسٹن میں ایک کتاب بلیک ہول (BLACK HOLE) پر پڑھا تھا۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ میں اس کا خلاصہ کرنا چاہتا ہوں، مگر وقت میرے پاس نہیں ہے، میرے قریب ایک بچہ کھڑا تھا جس نے درجہ ۵ کا امتحان دیا تھا، اس نے فوراً کہا کہ میں اس کا خلاصہ تیار کرکے ابھی لاتا ہوں میں حیرت میں پڑ گیا۔ مگر واقعی ۱۵ منٹ میں اس نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ میرے سامنے رکھ دیا یہ کاغذ اس وقت بھی میرے فائل میں موجود ہے۔ یہ خلاصہ تیار کرنے میں اس نے کمپیوٹر کا استعمال کیا اور فوراً میرے پاس لے آیا یہ بچہ ریاضیات (MATHS) میں اتنا تیز ہے کہ درجہ چھ کا طالب علم ہونے کے باوجود اس کو اجازت دی گئی ہے کہ اس مضمون میں درجہ سات میں بیٹھے۔

اس طرح کی تکنیک اور ترغیبات سے ہمارے بچے محروم ہیں۔

محنت کا جائزہ:۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہر منصوبے یا محنت کا جائزہ لینا بہت ضروری سمجھتے ہیں تاکہ عمل کی خامیاں ابھر کر سامنے آجائیں۔ وہ لوگ ہر ذمہ دار شخص یا منصوبہ یا ادارہ کے کردار کا جائزہ وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے ہیں ہمارے یہاں جائزے کا خانہ خالی ہے اس لیے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہماری محنت کا تاثر کیا ہے اور اخراجات کے تناسب میں نفع بخشی ہوتی یا نہیں۔ یہاں جو ڈھرا چل پڑا وہ چل پڑا۔ خلاء اور کھائیاں پر کرنے کا کوئی نظام نہیں ہے۔ قدیم روش پر اڑے رہنا ہمارا روایتی مزاج ہے

ایک تجربہ:۔ لائبریری کا ذوق کتب بینی کی طرف ایک اہم قدم ہے مجھے یہ ذوق ورثہ میں ملا ہے میرے والد مرحوم اگرچہ پولیس کے ملازم تھے مگر ان کے پاس لائبریری بہت اچھی تھی اور بعض مکاتب کو ان کی تاکید تھی کہ

جو بھی نئی کتاب اسلام یا سیرت پاک پر آئے وہ ان کے پاس بلا آرڈر کے بھیج دی جاتے۔ اقبالیات کے بھی وہ بڑے شوقین تھے جب وہ سونے جاتے تھے تو مجھ کو بلا کر فرماتے تھے کہ کچھ مجھے پڑھ کر سناؤ تاکہ میں سو جاؤں۔ سیرۃ النبی (شبلی نعمانی) کے بیشتر حصے میں نے ان کو اس وقت پڑھ کر سنائے تھے جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ وہ ذوق اب بھی میرے ساتھ ہے اور ایک چھوٹی سی لائبریری میرے گھر میں ہے میرے بیٹے اور بہوؤں کے پاس بھی الگ الگ لائبریری ہے۔

میں جب الٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہاسٹل میں مقیم تھا تو پہلے ہی سال میں لائبریرین چن لیا گیا میں نے لائبریری کی تنظیم بڑے ذوق و شوق سے کی جھاڑ پونچھ سے لے کر کتابوں کی تقسیم تک ہر کام میں اپنے ہاتھ سے کرتا جب میرے سب ساتھی کھیل کے میدان میں ہوتے تو میں لائبریری میں پایا جاتا۔ میرے ذوق اور تنظیم کو دیکھ کر مولانا نامی (جو ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے) اتنا خوش ہوتے کہ انہوں نے چار سو روپے کا عطیہ نئی کتابیں خریدنے کے لیے پیش کیا۔ اب وہاں ایک تنخواہ دار جز وقتی لائبریرین ہے اور اکثر لائبریری بند رہتی ہے۔

یہی ذوق میرے ساتھ اسلامیہ کالج گیا۔ وہاں میں نے لائبریری کی خوب توسیع کی۔ سر عبدالرؤف سکشن اور سر شفاعت احمد خاں سکشن کے دو اہم ذخیروں کا اضافہ کیا۔ تاریخ کے سکشن میں مطالعہ کے لیے یونیورسٹی سے ریسرچ اسکالر آنے لگے، ہر کلاس کے بچوں کے لیے الگ الگ سکشن تیار کیے ہفتہ میں کم سے کم ایک دن ہر کلاس کے لیے لائبریری کا دن ہوتا تھا۔ بچوں کو کتاب کے بارے میں کچھ لکھنے کی بھی ترغیب دی جاتی تھی۔ اگر کچھ نہ لکھ سکیں تو کتاب کا نام اور مصنف کا نام اپنے لائبریری کارڈ پر لکھ دیں، بڑے بچے اخبار پڑھ کر روزانہ کی اہم خبریں پبلسٹی بورڈ پر لکھ دیا کرتے تھے۔

افسوس کہ ان کوششوں کی اب صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔

مولانا شبلیؒ کا انٹرویو:۔ ایم اے، او کالج علی گڑھ میں اساتذہ کا تقرر ہو رہا تھا۔ مولانا شبلیؒ بھی انٹرویو کے لیے بلائے گئے۔ جب وہ وقت مقررہ پر پہونچے تو سر سید نے انہیں لائبریری میں بٹھا دیا اور یہ کہکر چلے گئے کہ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ الماریوں کو تالے بند تھے۔ مگر شیشوں سے کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ شبلی صاحب ٹہل ٹہل کر کتابوں کا جائزہ لیتے رہے۔ سر سید گھوم پھر کر آئے تو فرمایا کہ "اب آپ کا انٹرویو کل ہوگا" دوسرے دن جب وہ تشریف لائے تو تالے کھلے ہوئے تھے اور وہ کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پھر سر سید تشریف لائے تو فرمایا کہ اب آپ کا انٹرویو کل ہوگا۔ اس دن لائبریری میں ایک میز بھی لگی تھی اور لکھنے کا سامان بھی تھا۔ اب شبلی صاحب کتابیں دیکھ بھی رہے تھے اور لکھ بھی رہے تھے، حسب معمول تھوڑی دیر کے بعد سر سید آئے اور فرمایا "مولوی شبلی آپ کا انٹرویو ہوگیا۔" اور آپ کالج کے استاد مقرر ہوگئے۔ اس سے

وم ہوتا ہے کہ سرسید کی نظر میں کتب بینی کی کیا عظمت تھی۔

آج جو اساتذہ مقرر ہوتے ہیں ان کی کتب بینی صفر سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کا وہ وقار
ں ہے جو پرانے اساتذہ کا تھا۔ میرے انگریزی کے استاد پروفیسر ادیب اُردو فارسی اور سنسکرت پر بھی گہری
رکھتے تھے۔

ـ شاپ کی سیر: ۔ حضرت مولانا نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کتابوں کی دو کانوں کی سیر ایک بڑی
صد تفریح ہے اس سے وسعت نظر اور ذوق مطالعہ کے علاوہ کبھی کبھی حیرت انگیز فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ ایک
م طالب علم جس نے آئی اے ایس میں ٹاپ (TOP) کیا تھا، اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ حضرت کتابوں
دو کانوں کی سیر کے عادی تھے۔ انٹرویو کے قریب جب دوکان کا دورہ کر رہے تھے تو ایک جدید ترین کتاب
ظر پڑی اس کو انہوں نے دلچسپی سے دیکھا اور اس کا بغور جائزہ لیا۔ اتفاق سے ممتحن صاحب بھی اسے دیکھ
ے تھے۔ اور اسی پر انہوں نے اپنے بہت سے سوالات مرتب کر لیے تھے، ہر امیدوار سے اسی پر سوال کرتے
ے جواب نہیں ملتا تھا۔ لیکن جب یہ پہونچے تو اس کے ہر سوال کا جواب آسانی سے دیتے رہے اس لیے انہوں
ے بہت اونچا اسکور کیا اور اوّل آ گئے۔

مگر ایک افسوس کی بات یہ ہے کہ عربی اور اُردو کتابوں کی دوکانیں اس طرح ترتیب نہیں دی جائیں کہ
ں گھوم پھر کر کتابیں دیکھ سکیں۔ خواہ انہیں کوئی کتاب خریدنا نہ ہو، لیکن انگریزی بک اسٹال ہندوستان
ں بھی ایسے ہیں کہ لوگ وہاں تقریباً جا سکتے ہیں اور جاتے ہیں۔

درسیات اور عمل: ۔ آج کل انگلستان اور امریکہ میں درسیات کو عمل سے جوڑنے کا کام بڑی
زی سے ہو رہا ہے ورجینیا میں نیا نصاب تعلیم پبلک کے مشورے کے لیے پیش ہوا۔ چھ سو [6] مرد اور عورتوں
نے نصاب پر رائے زنی کی مجلس میں حصہ لیا۔ عام مشورہ یہ تھا کہ عمل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ایک ماں نے بگڑ کر
ہا ورجینیا کے اعلیٰ عہدیداروں کے نام بتا کر کیا کروگے پہلے بچوں کو لائن سے کھڑا ہونا سکھاؤ۔ انگلستان میں سے
علمی کیپسول (CAPSULE) تیار کیے گئے ہیں جو بچوں کو عملی ترجیحات کی طرف موڑتے ہیں اور بچوں کو اپنی
دلچسپی کے مضامین خود چننے کا موقع دیا گیا ہے۔ امریکہ میں درسیات کے باہر بچے بہت سے کام کرتے ہیں مثلاً
جینڈ میں ایک طالبہ کو ہر ہفتہ ایک ضعیف بیوہ کی خدمت کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اور ہیوسٹن میں ایک طالب علم
و ہسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے ہفتہ ہفتہ جانا پڑتا تھا۔ ایک چھوٹا بچہ (عمر دس یا بارہ سال) اس کو
ایک سرٹیفکٹ انسداد منشیات کی مہم میں حصہ لینے کے لیے ملا تھا ہونہار بچے اپنا فاضل کریڈٹ حاصل کرنے
کے لیے چھٹیوں میں قومی خدمات کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کا اسکور بڑھتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسی

کوئی ترغیب نہیں ہے اور عوتی عمل کیلئے حسن اخلاق کو ذریعہ بنانا اور سیاست کا بوجھ گھٹانے اور سلسلہ گفتار مختصر کرنے کیلئے ضروری ہے۔

درسیات اور تحقیق:۔ قومی معیار تعلیم کی ایک حالیہ کانفرنس میں جو واشنگٹن میں منعقد ہوئی تھی، نیشنل ریسرچ کونسل کے چیئرمین اس پر زور دے رہے تھے "کہ نہ صرف سیکھنا اور مشق کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ طلباء میں مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت بھی ہونا چاہیئے، اس صلاحیت کو حاصل کرنے کیلئے راہ تحقیق سے گذرنا ضروری ہوگا تاکہ طلباء صرف الفاظ اور اصطلاحات کے الٹ پھیر میں گم نہ ہو جائیں بلکہ تفکر اور تدبر کی طرف مائل ہوں۔

جاپانی اسکول:۔ کہتے ہیں کہ واٹرلو (WATRlo) کی لڑائی کھیل کے میدان میں لڑی گئی اور جاپانی معاشیات کی جنگ کلاس روم میں لڑی گئی۔ ایک امریکی استاد جو دو سال سے وہاں پڑھا رہا ہے کہتا ہے کہ یہاں اسکول کا ڈسپلن ایسی سخت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ملٹری اکاڈمی ہے۔

۱۔ جاپانی بچے صبح کو ۲۵ سے ۳۰ منٹ اسکول کی صفائی کا کام کرتے ہیں اور غسل خانے وغیرہ بھی صاف کرتے ہیں

۲۔ بچے ایک دوسرے سے افضلیت کا نہ کوئی لباس پہن سکتے نہ کوئی چیز استعمال کر سکتے ہیں۔

۳۔ ہاتھ میں گھڑی باندھ کر نہیں آسکتے۔ ۴۔ رنگین جوتے نہیں پہن سکتے۔ ۵ لڑکیاں بالوں میں ربن نہیں لگا سکتیں۔ ۶۔ بالوں کو رنگ نہیں سکتیں۔ ۷۔ خوشبو لگا کر اسکول نہیں آسکتیں۔ ۸۔ میک اپ نہیں کر سکتیں ۹۔ گھٹنوں سے اونچا غرارہ نہیں پہن سکتیں۔ ۱۰۔ آرائشی لباس نہیں پہن سکتیں۔ ۱۱۔ جاپانی بچے نشہ کی کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتے۔ ۱۲۔ اسکول میں چھری چاقو کی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ ۱۳۔ جاپانی بچے اسکول سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ اسکول چھوڑتے وقت زار و قطار روتے ہیں۔ ۱۴۔ جاپانی شہروں میں ہر شام کو لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا جاتا ہے کہ اب چھ بج گئے ہیں اور بچوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا کار سنبھالیں اور گھر چلے جائیں۔

۱۵۔ جاپانی استاد اور شاگرد میں گہرا ربط ہوتا ہے اور جاپانی اسکول جاپان کی زندگی کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت مولانا کا یہ اشارہ کہ طلباء کو مطالعہ اور عمل کی طرف موڑ دینے کی ضرورت ہے وقت کی اہم ترین ہے۔ اس پکار پر عالمی تفکر جاری ہے اور مغربی ممالک کے نصاب تعلیم میں تیزی سے تبدیلی لائی جا رہی ہے کیونکہ علوم کا بوجھ بڑھ رہا ہے اور وقت کی کمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے نئی تکنیک کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ مثلاً قرآنی تعلیمات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ایک کیسٹ میں بھر دیا گیا ہے جس کا نام "عالم" ہے۔ دینی مدارس میں بھی درسی نصاب کے علاوہ غیر درسی طریقہ پر سائنس اور دیگر علوم جدیدہ کا ذوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض ملکوں میں یہ تحریک چل رہی ہے کہ اخلاق کا ایک عملی اور معیاری نصاب ماؤں کے ہاتھ میں دیا جائے کہ اپنے گھروں میں چلائیں۔ تاکہ نصاب کا ایک حصہ گھروں میں پورا ہو جائے اور مدرسہ کا کام اس پر عمل درآمد کرانا ہو، جس کیلئے کسی درسی تنظیم اور گھنٹے کی ضرورت نہ ہو۔ "حقیقی سلسلہ قرآن آپ سے مخاطب ہے" گھر کے درسیات کے طور پر تیار کیا ہے جس کی ایک قسط صرف ۵ منٹ میں سنائی جا سکتی ہے۔

Adarts-HRA-11/96

لات، عُزّیٰ اور منات

ایک مذہبی اور تحقیقی جائزہ

سب سے پہلے دنیا میں بت پرستی کی داغ بیل آلِ قابیل نے ڈالی کیونکہ انہوں نے اپنے سرداروں کے نام پر سُوَاع، یَغُوث، یَعوق اور نَسر[1] کے بت تراشے۔ یہ بت طوفانِ نوح سے قبل تراشے گئے اور طوفان کے بعد ساحل سے دست یاب ہوئے تو عمرو بن لحی[2] نے ان کو عربوں میں عام کیا اور پانچ مختلف قبائل کو یہ بت دیئے گئے۔ پھر قبائل میں اضافہ ہوتا گیا، نامی گرامی شخصیات مورتیوں کی شکل میں اپنے اپنے قبائل کا اثاثہ بنتی گئیں۔ یہ ۸ھ سے قبل تمام عرب میں بت پرستی کا عام رواج تھا۔ ان بت پرستوں کی نظر میں کعبۃ اللہ کی بزرگی تین سا ٹھ بتوں کی وجہ سے تھی، خانہ کعبہ کے عین سامنے ہبل کا بت نصب تھا، گویا بیت اللہ کی بزرگی کا وہ مدل گیا تھا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے قائم کیا تھا۔

ان بت پرستوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لات، عُزّیٰ اور منات کو حدودِ حرم کے تین مقام تصور کر ہوئے یہیں سے احرام باندھ کر کعبے میں جانا شروع کیا۔

یہ مضمون چونکہ تین بتوں سے متعلق ہے لہٰذا ہر بت کے بارے میں الگ الگ لکھا ہے اور سب سے لات، پھر عزّیٰ اور اس کے بعد منات کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے اور آخری بت کے بارے میں زیادہ تفصیل کی ہے اور سومنات پر محمود غزنوی کے حملے تک جائزہ شامل ہے۔

لات

اس کے بارے میں مولانا سید عبدالدائم الجلالی لکھتے ہیں۔ ”لات کا نام نبطی تھا۔ اقوام بابل کی دیویا سے یہ ایک دیوی تھی۔ ربّ الارباب یعنی خدائے خدا لگاں کی بہن یا بیٹیاں جہاں ما مناتو (مناۃ) اور استار وہاں لات بھی ایک بہن یا بیٹی تھی[3] یہ ٹھیک ہے کہ لات کو (نعوذ باللہ) خدا کی بہن یا بیٹی کا درجہ دیا گیا، لیکن

---

[1] یاقوت بن عبداللہ، معجم البلدان، ص ۱۹۵ [2] ایضاً، ص ۱۹۵

[3] سید عبدالدائم الجلالی، لغات القرآن جلد ۵، ص ۱۹۹

درجہ کئی صدیوں بعد دیا گیا، کیونکہ نہ تو لات کسی دیوی کی شکل پر تھی اور نہ کسی دیوتا کی شکل پر اور نہ اس کا نام نبطی تھا بلکہ اولادِ آدم میں قابیل کا ایک بھائی نبطی تھا جس کی قوم نے سورج کی پرستش شروع کی۔" ولسن کی یہ صراحت کہ لات سورج کی دیوی تھی صحیح ہے۔ اس کی تائید اسٹرابو کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نبطی لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے"۔[1]

لیکن اہلِ حجاز کی رائے لات کے بارے میں یہ ہے کہ "ایک نیک شخص تھا (جو) موسمِ حج میں حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا۔ اس کی موت کے بعد لوگوں نے اس کی قبر پر مجاورت شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اس کی عبادت کرنے لگے"[2] تقریباً یہی رائے لغات القرآن میں ابن عربی سے بھی نقل کی گئی ہے۔ حالانکہ لات طوفانِ نوح سے پہلے کا ہے کیونکہ نبطی قوم طوفانِ نوح سے قبل کی ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کعبہ کے بعد لات کو ایک نیک شخص سے تشبیہ دینا درحقیقت لات کے تقدس میں ایک اضافی کوشش ہے۔ یہ حتمی بات ہے کہ لات نبطی قوم کی ایک دیوی تھی جس کا درجہ کم از کم سورج کی دیوی کے طور پر تھا، لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کو بغداد یعنی بابل سے دسرتھ کے زمانے میں منتقل کیا گیا یا حضرت شعیب علیہ السلام کے بعد، جہاں تک اہلِ بابل کا تعلق ہے، یہ لوگ مذہبی اور سیاسی طور پر مصریوں کے ماتحت تھے اور بابل کی حکومت ایک طرح سے مصری حکومت کا صوبہ تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دونوں خاندانوں کے قریبی تعلقات قائم تھے، کیونکہ دسرتھ کی "لڑکی فرعونِ مصر آخنیطون سے بیاہی گئی تھی"۔[3] یہ وہی دسرت ہے جس کو ہندوستان میں رام کا بیٹا کہا جاتا ہے، اور آخنیطون کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اس نے بت پرستی اور بت تراشی قطعاً ممنوع قرار دے دی تھی"۔[4] لہٰذا ممکن ہے لات بھی اسی دوران مصر و بابل سے دور مقام پر لے جایا گیا ہو اور یہ مقام ہی حجاز ہو، لیکن تاریخی شہادتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک نہ تو کعبہ تعمیر ہوا تھا اور نہ اس مقام پر آبادی تھی، لہٰذا یہی رائے دی جا سکتی ہے کہ اس کی عبادت چوری چھپے اہلِ بابل کرتے رہے اور حضرت ابراہیمؑ کے نقلِ وطن کے کچھ عرصے بعد اس کو بھی حجاز میں لے جایا گیا جہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم (اس کو) پوجتی تھی اور زمانۂ جاہلیت تک اس کی پرستش برابر جاری رہی۔[5]

یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لات کی شکل و صورت کیا تھی کیونکہ نہ تو یہ انسانی شکل کے مشابہہ تھا

---

[1] سید عبدالدائم الجلالی، لغات القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۹۹ [2] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، جلد ۵، صفحہ ۲۷

[3] ہفت روزہ عوام نئی دہلی ۳ نومبر ۱۹۷۷ء [4] ایضاً

[5] فرہنگ آصفیہ، جلد ۴، صفحہ ۱۵۵

اور نہ کسی جانور کی شکل کے، بلکہ صرف چوکور پتھر تھا۔ ابنِ کثیر لکھتے ہیں: "لات ایک سفید منقش پتھر تھا[۱]" گویا پتھر کی سفیدی کو سورج کی روشنی پر محمول کر کے ایک امتیازی درجہ دیتے ہوئے لات کی عبادت اسی طرح شروع کر دی جس طرح سورج کی کرتے تھے۔

پتھر کی سفیدی یا روشنی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تسلیم کیا اور کعبے کی دیواروں میں حجرِ اسود کو نصب کیا تاکہ طواف کی ابتدا کے لیے مقام متعین کیا جا سکے۔ اس کے بارے میں تاریخِ مکہ میں تحریر ہے "اس پتھر کا نور اس وقت اس درجہ روشن تھا کہ اس سے خانہ کعبہ کے ہر طرف کے مذابح چمکتے تھے لیکن کفر کی نجاستوں اور بنی آدم کے گناہوں نے اس کو سیاہ کر دیا" [۲]

غرض لات کو عرب قبائل میں سے قبیلہ ثقیف[۳] کی حمایت حاصل تھی جس طرح منات کو اوس و خزرج[۴] کی اور عزیٰ کو بنی ہاشم و بنی اسد کی[۵] لیکن لات کو "ان لوگوں نے لفظِ اللہ سے لفظِ لات بنایا تھا، گویا اس کی مونث قرار دیا تھا"[۶] یوں تو تینوں ہی مونث تھے لیکن اللہ کی مونث صرف لات تھا۔ سورہ نجم کی ۱۹ تا ۲۶ آٹھ آیتیں اسی بارے میں ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ اور منات تیسرے پچھلے کو، کیا تمھارے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے ان کے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اُتاری یہ لوگ تو صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ کیا ہر شخص جو آرزو کرے اُسے میسر ہے؟ اللہ ہی کے قبضے میں ہے یہ جہان اور وہ جہان۔ بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لیے چاہے اجازت دے دے۔"

گویا اس آیت میں بت پرستوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ خدا کے ہاں یہ بت سفارش کا ذریعہ نہیں بن سکتے جب کہ فرشتے بھی سفارش نہیں کر سکتے، بلکہ صرف خدائے واحد کی عبادت باعثِ نجات ہو سکتی ہے۔ مسلمان چونکہ ان بتوں کو لائقِ عبادت یا ذریعۂ نجات نہیں مانتے تھے لہٰذا پہلا کام فتح مکہ کے بعد یہ ہوا کہ ان بتوں کو مسمار کر دیا گیا۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کعبے کے اندر باہر اور ہر طرف جس قدر اصنام تھے ان کو توڑ

---

۱ ابنِ کثیر، جلد ۵، ص۲۷
۲ حاجی محمد فخرالدین حسن خان: خلاصۂ تواریخ مکہ معظمہ، ص۱۹
۳ ابنِ کثیر، ص۲۶
۴ طبری، جلد اوّل، ص۵۰۴
۵ ایضاً، ص۲۴
۶ ابنِ کثیر، ص۲۶

کر گرا دینے کا حکم دیا۔"[1] اور اس حکم پر فوری طور پر عمل کیا گیا۔ ابنِ ہشام نے فتح مکہ اور بتوں کو توڑنے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور ان کا یہ بیان عبداللہ ابن عباس سے منقول ہے کہ "فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل شہر ہوئے تو آپؐ اونٹنی پر سوار تھے۔ اس پر بیٹھے بیٹھے طواف کیا۔ بیت اللہ کے چاروں طرف سیسے سے جمے ہوئے بت نصب تھے۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک لکڑی تھی، اس سے بتوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (حق آگیا اور باطل چلا گیا، بے شک باطل جانے اور زائل ہونے والا ہی تھا)۔ چنانچہ بت، جس کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے، وہ گدی کے بل اور جس کی گدی کی طرف اشارہ کرتے وہ چہرے کے بل خود بخود گرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی بھی بت باقی نہ رہا، سب گر گئے۔"[2]

یہ ٹھیک ہے کہ ان بت پرستوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں زیادہ جم کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ لوگ زیادہ عرصہ متحد نہ رہ سکے، کیونکہ ان کے ہاں سینکڑوں قبیلے اپنے اپنے بتوں کے گرد جمع تھے، لہٰذا اس کا بڑا فائدہ مسلمانوں کو ہوا، حالانکہ ابرہہ کے حملے کے دوران بھی ان بت پرستوں نے خانہ کعبہ کو تو چھوڑ دیا تھا لیکن اپنے اپنے معبدوں میں مقابلے کے لیے تیار تھے۔ یہی بڑی کمزوری تھی جس کی بنا مسلمانوں کی تبلیغ کو یہ لوگ نہ روک سکے اور اسلام پھلتا پھولتا رہا۔ پھر یہ کہ عیسائی اور یہودی ان بت پرستوں کی پوری طرح مدد نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کو بھی بت پرستی کی یہ شکل پسند نہ تھی جو عربوں نے اختیار کر لی تھی اور ایک دو کی جگہ سینکڑوں بت بنا لیے تھے۔

جب اہلِ طائف کو خانہ کعبہ کے بتوں کی پامالی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوراً رسول اکرمؐ سے عرض کیا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "طاغیہ" یعنی لات کو ان کے لیے چھوڑ دیں اور اسے تین سال تک منہدم نہ کریں۔"[3] لیکن رسولِ اکرمؐ نے کسی بھی ایسے مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا اور "ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ کو طاغیہ (لات کے بت کدے) کے انہدام کے لیے بھیجا۔"[4]

بہرحال اہلِ طائف کے قبیلہ ثقیف کا بت لات بھی توڑ دیا گیا جس طرح دیگر بتوں یا قبوں کو ڈھا دیا گیا تھا۔

---

[1] ابنِ خلدون: تاریخ ابنِ خلدون حصہ سوم صفحہ ۱۸۸ - ۱۹۱۱ء

[2] ابنِ ہشام: سیرت النبیؐ کامل، صفحہ ۴۹۲

[3] ابنِ ہشام، صفحہ ۶۵۰

[4] ایضاً، صفحہ ۶۵۲

عُزّیٰ

عُزّیٰ لفظ عزیز سے لیا گیا ہے[1] گویا جس طرح عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا گیا اسی طرح عزیٰ کو بیٹی بنا دیا گیا۔ لیکن اس بیٹی کی شکل بھی انسانی نہ تھی۔ علامہ ابن جریر الطبری نے اس کی شکل وصورت کے بارے میں مختلف اقوال تحریر کیے ہیں، مثلاً "مجاہد کے مطابق یہ کچھ درخت تھے۔ سعید بن جبیر کے مطابق یہ ایک سفید پتھر تھا۔ ابن زید کے مطابق یہ طائف کا ایک سٹھ تھا"[2] سعید بن جبیر اور ابن زید نے لات کا تطابق عُزّیٰ پر کیا ہے حالانکہ عُزّیٰ طائف میں نہیں تھا بلکہ وہاں لات تھا، پھر یہ کہ عُزّیٰ پتھر ہی نہیں تھا۔ بلکہ صحیح روایت مجاہد ہی کی ہے، کیونکہ تاریخی واقعات اور دیگر مصنفین کی رائے یہی ہے کہ "عزیٰ ایک کیکر (یا ببول) کا درخت تھا، جس کی قبیلہ غطفان پوجا کیا کرتا تھا۔"[3] ابن کثیر بھی یہی لکھتے ہیں کہ "مکے اور طائف کے درمیان نخلہ میں یہ ایک درخت تھا۔"[4]

اس درخت کو پوجنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت عزیر علیہ السلام بخت نصر کی قید سے رہائی کے بعد جس درخت کے نیچے سوئے تھے۔ "اللہ تعالیٰ نے اسے ایک سو سال تک سویا ہی رکھا۔"[5] لہٰذا بخت نصر کی قید سے دیگر لوگ جو رہا ہوئے تھے وہ بھی بابل ہی میں قید تھے اور یہ علاقہ بت پرستی میں اپنی مثال آپ تھا، یہی وجہ تھی کہ اس درخت کو بھی مقدس خیال کیا جانے لگا اور باقاعدہ قبہ بنا لیا اور چادریں چڑھائی جانے لگیں۔

یہی وہ عزیٰ تھی جس کی دوہائی ابو سفیان نے جنگ احد میں دی تھی۔ لنا العزّیٰ ولا عُزّیٰ لکم (ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا نہیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "جواب دو اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم"۔ "اللہ ہمارا والی ہے اور تمہارا والی کوئی نہیں"[6]

فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو عزیٰ کے ڈھانے کے لیے بھیجا۔ "عزیٰ تین ببول (یا کیکر) کے درختوں پر مشتمل ایک سٹھ یا قبہ کی شکل کا تھا، خالد بن ولید نے اسے ڈھا دیا اور واپس آکر حضور اکرم کو اس کی اطلاع دی جس پر آپ نے فرمایا "تم نے کچھ نہیں کیا، لوٹ کر پھر دوبارہ جاؤ۔"[7] گویا ابن کثیر کے مطابق حضرت خالد بن ولید دو دفعہ اس کو ڈھانے گئے، بلکہ عزّیٰ کو قتل کرنے گئے۔ کیونکہ

---

[1] ابن کثیر، جلد پنجم، ص ۲۷ — [2] لغات القرآن، جلد ۴، ص ۲۹۲

[3] لغات القرآن، جلد ۴، ص ۲۹۲ — [4] ابن کثیر، جلد ۵، ص ۲۷

[5] منہاج سراج عثمانی، طبقات ناصری، جلد اوّل، ص ۱۹۱ — [6] ابن کثیر ص ۲۷ نیز لغات القرآن، جلد ۴، ص ۲۹۴، ۲۹۵

[7] ابن کثیر، جلد ۵، ص ۲۷

..سری دفعہ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا " ایک ننگی عورت ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور اپنے سر پر مٹی ڈال
رہی ہے ، آپ نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا اور واپس آکر حضورؐ کو خبر دی ۔ آپؐ نے
فرمایا عزیٰ یہی تھی۔[۵] ابن کثیر نے واقعات کو خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ دیگر تاریخوں سے ان کے بیان کی تائید نہیں
ہوتی ، پھر یہ کہ ایک عورت اتنے طویل عرصے تک یعنی حضرت عزیر کے بعد سے حضورِ اکرمؐ کے عہد تک کس طرح
زندہ رہ سکتی ہے ۔ لہٰذا صحیح بیان ابن اثیر کا ہے جو اس طرح ہے کہ "جب خالد اس (عزیٰ) کے قریب پہنچے تو
پجاری نے کہا اے عزیٰ ! اپنے غصے اور غضب کو ظاہر کر ۔ پس ایک سیاہ فام برہنہ عورت اس کے اندر سے
چیختی چلاتی اور روتی ہوئی نکلی ، خالد نے اس عورت کو قتل کر دیا اور بت توڑ ڈالا اور عمارت کو ڈھا دیا ۔
واپس آکر جب انہوں نے آنحضرتؐ کو اس واقعے کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ اب اس عزیٰ کی پوجا کبھی نہیں
ہوگی ۔"[۲] چنانچہ آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی ۔

منات

یہ بت بھی اپنی قدامت میں کسی اور سے کم نہ تھا ۔ پھر یہ کہ اس کے بارے میں عبرانی ، عربی اور سنسکرت تینوں
زبانوں میں ذکر موجود ہے ، لیکن ہر جگہ معمولی سا تحریری اور مخرج کا فرق ہے ۔ اس فرق کی وجہ صرف یہ ہے کہ
یہ بت مختلف جگہوں پر مختلف اوقات میں منتقل ہوتا رہا ۔ لہٰذا ہر علاقے کی جداگانہ زبان اور خاص کر طویل مدت
نے اپنا اثر دکھایا ۔ اہلِ بابل نے اس کو عبرانی زبان میں " بنات "[۳] کہا ، سنسکرت میں نات یا ناتھ"[۴] اور عربی
میں " منات "[۵] لکھا گیا اور عرف عام میں بھی اسی طرح مشہور ہوا ۔

شیخ فریدالدین عطار ہندوستان کے سومنات کے بارے میں کہتے ہیں " سومنات مرکب ہے سوم اور
نات سے ، اور نات اس بت کا نام ہے جو بت خانے میں رکھا ہوا تھا ،"[۶] فرشتہ کی رائے میں " سوم اس بادشاہ
کا نام ہے جس نے اس بت کو بنایا تھا اور نات خود اس بت کا علم ہے "[۷]

فرشتہ کی رائے دراصل اسرائیلیات پر مبنی ہے اور درست بھی ہے ، کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے ماننے والے
یعنی بنی اسرائیل ہر پیغمبر کی تردید کر کے اپنے بتوں کو مانتے تھے ۔ تمام بڑے بڑے علاقوں مثلاً مصر ،
...ل ، بابل اور اسور وغیرہ میں بت پرستی عام تھی اور اسی زمانے میں " شاہ اسور سلمنسر نے سامریہ پر چڑھائی

---

۵ ابن کثیر ، جلد ۵ ، صـ۲۷ ۲ ابن اثیر ، صـ۲۳۰ ۳ عہد نامہ عتیق صـ۳۸۲

۴ فرشتہ ، صـ۱۰۶ ۵ سورہ نجم ، ۱۹ ۔

۶ تاریخ فرشتہ ، صـ۱۰۶ ۷ ایضاً

کی اور اس کا محاصرہ کر لیا"[1] بالآخر فتح شاہ اسور کو ہوئی۔ حملے کی وجہ یہ تھی کہ مفتوح ہوسیع اسرائیل جو سامریہ میں سلطنت کرتا تھا پہلے سے شاہ اسور سلمنسر کا باج گزار تھا۔ لیکن ان دنوں جب کہ اس پر حملہ ہوا "اس نے شاہِ مصر "سو" کے پاس ایلچی بھیجے تھے اور شاہ اسور کو ہدیہ نہ دیا جیسا وہ سال بہ سال دیتا تھا"[2] گویا سامریوں کے مصریوں سے اچھے تعلقات تھے۔ خواہ یہ تعلقات سیاسی ہوں یا مذہبی۔ لیکن جب سامریوں کو شاہ اسور نے قید کیا تو ان کی جگہ "شاہ اسور نے بابل اور کوتہ اور عوّا اور حمات اور سفروائم کے لوگوں کو لا کر بنی اسرائیل کی جگہ سامریہ کے شہروں میں بسایا"[3] ان مختلف علاقوں کے لوگوں نے سامریہ کے طرز پر عبادت نہ کی جیسا کہ عہد نامہ عتیق میں لکھا ہے۔ لہٰذا "ہر قوم نے اپنے دیوتا بنائے اور ان کو سامریوں کے بنائے ہوئے اونچے مقاموں کے مندروں (دیر) رکھا۔ ہر قوم نے اپنے شہر میں جہاں اس کی سکونت تھی ایسا ہی کیا سو بابلیوں نے سکات بنات کو اور کوتیوں نے سیبر گل کو اور حماتیوں نے اسیما کو بنایا"[4] گویا اہل بابل کے معبود سکات بنات تھے۔ یہی بنات جب سامریہ میں لایا گیا تو اسے منات کے نام سے پکارا گیا۔ یاقوت نے اپنی تصنیف معجم البلدان میں سامریہ کی جگہ لفظ سامرہ استعمال کیا ہے۔ ان کے مطابق "سامرہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بستی" تھی[5] جب کہ مشلّل اور قدید کو بھی مکہ اور مدینہ کے درمیان بتایا جاتا ہے، جہاں منات کا بت نصب تھا۔

بہرحال جہاں تک بنات یا منات کا تعلق ہے، اس بارے میں یہی رائے دی جا سکتی ہے کہ اس نام کو محفوظ کرنے میں اگر ایک طرف عبرانی زبان کا ہاتھ ہے تو دوسری طرف سنسکرت ادب کا بھی بڑا دخل ہے جس نے لفظ نات (ناتھ) کو محفوظ کیا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس زبان کے لوگوں نے اپنی زبان کو اور اپنے ادب کو دیگر زبانوں کی طرح خلط ملط نہیں ہونے دیا۔ ورنہ آج لوگ منات کی حقیقت سے آشنا نہ ہوتے۔

منات حجاز میں

اہلِ بابل کا بنات جب مکہ اور مدینہ کے درمیان جب سامرہ اور مشلّل میں منتقل ہوا تو اُسے منات کے نام سے پکارا گیا، اور فتح مکہ تک قبیلہ خزاعہ، اوس اور خزرج کی عظمت کا نشان بنا رہا۔ لات و عزیٰ کے برعکس یہ بت انسانی شکل پر تراشا گیا تھا لیکن "عورت کی شکل میں تھا"[6] یاقوت اپنی تصنیف میں اس بت کے مقام نصیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ مکّے اور مدینے کے درمیان قدید کے ساحل بحر پر نصب تھا"[7] جب طبری اور ابن کثیر

---

[1] عہد نامہ عتیق باب ۱۸، سلاطین ۲، آیت ۹، صـ۳۹۲ [2] ایضاً، باب ۱۷، آیت ۴

[3] عہد نامہ عتیق باب ۱۷، آیت ۲۴، صـ۳۸۱ [4] ایضاً، آیت ۲۹، صـ۳۹۲

[5] معجم البلدان، صـ۱۸۲ [6] لغات القرآن، جلد ۵، صـ۵۳۴ [7] معجم البلدان، صـ۲۲۹

کی رائے یہ ہے کہ یہ قدید کے پاس مشلّل (یا مشلشل) میں واقع تھا۔[۱] ابن کثیر اور طبری نے ذرا سی غلطی کی ہے۔ ان کے نزدیک قدید ایک ضلع تھا جس میں یہ مشلّل بھی شامل تھا حالانکہ مشلّل کوئی ضلع نہیں بلکہ ایک پہاڑ تھا جو سمندر کے ساتھ ساتھ تھا اور اسی پہاڑ پر منات کا مندر تھا۔

منات مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھا لہٰذا لوگوں نے حدودِ حرم میں داخل ہونے کے لیے مشلّل کو بھی حدودِ حرم بنا لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ حج کو روانہ ہوتے سے پہلے احرام یہیں سے باندھ کر روانہ ہوتے تھے۔ اسی لیے حضرت عائشہ رضؓ نے ایک دفعہ فرمایا (اسلام سے پہلے) انصار منات کے لیے احرام باندھتے تھے،[۲] گویا انصار مدینہ منورہ سے بغیر احرام باندھے نکلتے تھے اور ارادۂ حج منات کے سامنے یا مندر میں کرتے اور یہیں سے احرام باندھتے اس لیے کہ یہ مقام حرم کی حدود متعین کرتا تھا۔

اسی طرح عزّیٰ اور لات کے مقامات سے بھی احرام باندھ کر لوگ نکلتے اور خانہ کعبہ کی عزت و تعظیم بھی کرتے بلکہ مقامِ عبادت کعبۃ اللہ کو سمجھتے تھے۔

ان تینوں بتوں کے ماننے والے اور کعبے کے متولّی دیگر علاقوں کے لوگوں اور دیگر ممالک کے باشندوں کو حج کا موقع فراہم کرنے کے لیے ایّامِ حج میں لڑائی جھگڑوں سے باز آجاتے تھے اور انہوں نے کعبۃ اللہ سے لات، منات، اور عزّیٰ کے علاقے کو تین طرف سے حدودِ حرم قرار دے دیا تھا تاکہ لوگ بے خوف و خطر حج کر سکیں۔ یوں تو کعبے میں ایک بڑا بت ہبل تھا اور تین سو ساٹھ چھوٹے چھوٹے اور بت بھی موجود تھے، لیکن اس کے باوجود ان تین بتوں کی یہ اہمیت تھی کہ جب لوگ طواف کرتے تو یہ پڑھتے تھے ”لات، عزّیٰ اور تیسرا منات یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔“[۳]

بہرحال جس طرح فتح مکہ کے بعد لات اور عزّیٰ کو توڑا گیا اسی طرح منات کو توڑنے کا حکم بھی دیا گیا، لیکن منات کے توڑنے کی بابت مورخین اور مفسرین کی رائے میں اختلاف ہے۔ طبری اور ابن اثیر کے مطابق منات کو سعد بن زید الاشہلی نے توڑا۔[۴] ابن کثیر کی رائے میں اسے توڑنے کے لیے آنحضرتؐ نے ابوسفیان کو بھیجا اور وہ اس کو ریزا ریزا کر آئے۔ بعض کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے یہ کفرستان فنا ہوا، اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو توڑ دیا تھا۔[۵]

۱؎ طبری، ص۵۰۴ - ابن کثیر، جلد ۵، ص۲۷ ۲؎ لغات القرآن، جلد ۵، ص۳۵۴

۳؎ ایضاً، جلد ۴، ص۲۹۳ ۴؎ طبری جلد اوّل، ص۵۰۴ - ابن اثیر، ص۱۴۳

۵؎ ابن کثیر، جلد ۵، ص۲۸ - معجم البلدان، ص۳۲۹

منات کو توڑنے کے بارے میں زیادہ مواد نہیں ملتا، طبری نے صرف دو سطریں لکھی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد بن زید الاشہلی نے منات کو توڑا تھا۔

اہلِ ہند اور منات

اگر یہ مان لیا جائے کہ عربوں کا منات سعد بن الاشہلی نے توڑا تھا تو چار سو سال بعد جس منات کے توڑنے کا انکشاف محمود غزنوی پر کیا گیا وہ کون سا تھا اور کس طرح پٹن یعنی سومنات میں لایا گیا۔

جہاں تک ہندی تاریخ کا تعلق ہے، اس کے مطابق یہ مندر نہایت قدیم ہے اور "یہ بت ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سری کرشن کے زمانے سے اسی جگہ تھا جس کو چار ہزار برس سے کچھ زیادہ ہوئے۔"[1] دوسری شہادت اس بارے میں جوناگڑھ کی غیر مطبوع تاریخی دستاویزات ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ عربوں کے علاقے سے منات کو چند عرب اٹھا کر لائے تھے۔

سب سے پہلے سری کرشن کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ وہی کرشن ہیں جن کے اپدیش بھگوت گیتا کی شکل میں آج بھی موجود ہیں، لیکن مورخین کو دو باتوں پر اعتراض ہے۔ اوّل یہ کہ سری کرشن کا زمانہ چار ہزار برس پرانا ہرگز نہیں بلکہ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۰۰۰ قبل مسیح تک کے درمیان کا ہے۔

دوسری بات یہ کہ کرشن اس مقام پر کبھی نہیں آئے اور نہ مہابھارت کی جنگ ہندوستان میں لڑی گئی۔ یہ بات صرف انکشاف پر مبنی نہیں بلکہ عراق اور ہندوستان کے ٹھوس تاریخی اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہے جو لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب نے اپنی تصنیف "معارف الآثار" میں جمع کیے ہیں۔ ان کے مطابق "مہابھارت کی جنگ ہندوستان میں نہیں بلکہ شمال مغربی عراق میں اربیلا کے میدان میں ہوئی۔ یہ میدان کردستان کی سرحد پر واقع ہے اور درحقیقت یہی میدان کوروکشیترا ہے۔"[2]

ان دلائل کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موجودہ کُرد قوم ہی کورو ہیں، گویا سری کرشن درحقیقت عراق سے متعلق ہیں اور یہیں سے یہ آریائی ہندوستان پہنچے، جہاں انہوں نے اپنی رزمیہ داستانوں کو قلم بند کیا — بالفاظِ دیگر مذہبی و تاریخی واقعات عراقی تھے تو زبان ہندوستانی تھی اور اسی زبان کی بدولت عراقی دیوتا بھی ہندوستان کے دیوتا بن گئے۔

سومنات کی تعظیم

ہندو اس مندر کی تعظیم اس لیے بھی کرتے تھے کہ ان کے نزدیک کرشن نے یہیں روپوشی اختیار کی تھی۔ پھر

[1] بدایونی، ص۲۰۔ [2] ہفت روزہ عوام ۴ نومبر ۱۹۷۷ء، ص۲

یہ کہ" ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ روحیں بدن سے جدا ہونے کے بعد سومنات ہی میں آکر جمع ہو جاتی ہیں، سومنات انہیں جس جس بدن میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے[۱] دوسری عقیدت ان کی سمندر کے اس پانی کے بارے میں تھی جو سومنات کے مندر سے ٹکراتا تھا جس کے متعلق ان کے رائے یہ تھی کہ" سمندر اس بت کے قدم چومنے کے لیے آتا ہے۔"[۲] کیونکہ یہی مہادیوی تسلیم کی گئی تھی۔

اسی عقیدت مندی کی بنا پر راجے اور امراء" اپنی بیٹیوں کو سومنات کی خدمت کے لیے نذر بت خانہ کردیتے تھے اور یہ لڑکیاں تمام عمر ناکتخدا رہ کر بت خانے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔"[۳] اس لیے کہ اس بت خانے میں بے شمار لوگ نہ صرف زیارت کے لیے آتے تھے بلکہ اس بت خانے کے خادمین میں سیکڑوں ایسے افراد شامل تھے جن کے اخراجات کا دارومدار دیہات سے وصول شدہ رقوم پر تھا۔ فرشتہ کے مطابق" بت خانے کی تباہی کے وقت تقریباً" دو ہزار قصبوں کی آمدنی اس کے اخراجات کے لیے وقف تھی۔[۴] یہ دیہات لوگوں نے منات کے مندر کے لیے وقف کیے تھے۔ اسی لیے" پانچ سو گانے بجانے والیاں اور تین سو مرد ساز ندے بت خانے کے ملازم تھے۔"[۵] اور تین سو حجام جاتریوں کے سر اور داڑھی مونڈھنے کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔"[۶]

جب اس بت سے راجاؤں کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا تو عوام الناس کے جذبۂ عقیدت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی بڑی تعداد میں زیارت کی غرض سے آتے تھے۔ اس کے لیے صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ" دو ہزار برہمن ہر وقت بت خانے کی پرستش کے لیے موجود رہتے تھے۔"[۷] ان اعداد و شمار کی روشنی میں عوام کی کثرت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے" جب کبھی چاند یا سورج گرہن ہوتا تو تقریباً" دو لاکھ تیس ہزار آدمی سومنات کے بت خانے میں جمع ہو جاتے تھے۔"[۸] اگرچہ بہ ظاہر یہ بات قابل یقین معلوم نہیں ہوتی لیکن ابن خلدون کا وہ بیان جو اس نے اس بت خانے کی وسعت کے بارے میں دیا ہے اس کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ لکھتے ہیں۔" بت خانے کی عمارت نہایت عظیم الشان اور وسیع تھی، چھپن مرصع ستونوں پر وہ عمارت قائم تھی۔"[۹] لہٰذا ایسی وسیع و عریض عمارت میں دو لاکھ آدمیوں کا سما جانا مشکل نہیں ہوگا۔

---

[۱] بدایونی، ص۷۔ ابن خلدون، ص۲۰۳ [۲] ابن خلدون، ص۲۰۳
[۳] فرشتہ، ص۱۰۷ [۴] ایضاً، ص۱۰۶ [۵] ایضاً، ص۱۰۷
[۶] ایضاً، ص۱۰۷ [۷] ایضاً، ص۱۰۷ [۸] ایضاً، ص۱۰۷
[۹] ابن خلدون، جلد ۲، ص۲۰۳

بت خانے کے جواہرات اور سونا

عبادت گزار لوگوں کو بلانے کے لیے اس مندر میں "بت کے قریب طلائی زنجیر میں ایک سو من وزن کا گھنٹہ لٹکا ہوا تھا،" سونے کی یہ دو سو من کی زنجیر بت خانے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک باندھ رکھی تھی[1] لہٰذا اس عظیم الشان ہال کی لمبائی یا چوڑائی سے زنجیر کی لمبائی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ زین المآثر میں لکھا ہے کہ بت خانے کی وہ خاص جگہ جہاں سومنات رکھا ہوا تھا، بالکل تاریک تھی اور جو روشنی وہاں پھیلی ہوئی تھی وہ ان گراں بہا جواہرات کی شعاعیں تھیں جو بت خانے کی قندیلوں میں جڑے ہوئے تھے۔ اسی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سومنات کے خزانے سے اس قدر چھوٹے چھوٹے بت سونے اور چاندی کے برآمد ہوئے کہ ان کی قیمت کا اندازہ لگانا تقریباً محال ہے، چنانچہ حکیم ثنائی فرماتے ہیں۔

کعبہ و سومنات چوں افلاک شد ز محمود و از محمد پاک

ایں ز کعبہ بتاں بروں انداختہ آں ز کیں سومنات را پرداختہ[2]

ابن خلدون اس بت خانے کے دھن و دولت کی بابت لکھتا ہے، "بت کدہ کے دروازے پر زربفت کے پردے پڑے تھے، جن کی جھالروں میں موتی اور جواہر لٹکے ہوئے تھے، ان میں سے ہر ایک کی قیمت بیس بیس ہزار دینار تھی۔"[3]

لیکن مندر میں آنے والے عقیدت مند سونے، چاندی اور جواہرات سے بے نیاز ہو کر ایک پتھر کے تراشے ہوئے بت کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ اس بت کے بارے میں "تاریخ خیرات" اور تاریخ ابن خلدون میں یہ تحریر ہے کہ "سومنات کا بت پتھر تراش کر بنایا گیا جو پانچ گز لمبا اور تین گز چوڑا تھا، جب کہ فرشتہ لکھتا ہے کہ یہ بت دو گز زمین میں گڑا ہوا تھا اور تین گز باہر تھا۔"[4]

تاریخ کی مذکورہ بالا کتابیں فتح سومنات کے بہت بعد لکھی گئیں، لہٰذا اصل واقعات سامنے لانے کے بجائے افسانہ نگاری کر کے ہندی فنِ تعمیر کو بدنام کیا گیا اور فتح سومنات کی اصل وجہ کو پس منظر میں لے گئے تاکہ عربوں کے منات کی اصل حقیقت سے لوگ روشناس نہ ہوں، اسی طرح ہندی مورخین نے بھی محمود غزنوی پر الزامات لگائے کی خاطر سومنات کی دولت کو حملے کی وجہ بتایا ہے، حالانکہ اس سومنات سے زیادہ مال و دولت اسے متھرا کے بت خانے سے ملا تھا۔ یہ بات محمود کے عہد کا مورخ بیہقی لکھتا ہے کہ "ان بت خانوں میں پانچ سونے

---

[1] ابن خلدون، ص۲۰۳ ۔ تاریخ فرشتہ، ص۱۰۷ [2] تاریخ فرشتہ، ص۱۰۷، ۱۰۸

[3] ابن خلدون، ص۲۰۳ [4] بیہقی، تاریخ بیہقی، ص۴۹۸ ۔ ابن خلدون، ص۲۰۳ ۔ فرشتہ، ۱۰۵

کے بت تھے جو پانچ گز کے تھے اور ہوا میں معلق تھے، ان کی آنکھ میں یاقوت جڑے ہوئے تھے انہوں نے (ہندوؤں نے) یہ ترکیب کی تھی کہ اگر سلطان ان کو بازار میں بیچنا چاہے تو ان کی قیمت پچاس ہزار دینار سے زیادہ ملے اور اسے کوئی بھی برضا و رغبت خرید لے۔ دوسرے بت میں ایک ٹکڑا یاقوت کا جڑا ہوا تھا جو چمکدار اور بیش بہا قیمت کا یاقوت تھا، جس کا وزن چار سو پچاس مثقال تھا۔ سونا اور چاندی کے بت اس کے علاوہ تھے، جن کا موازنہ پرانے وزن سے کیا جا سکتا ہے۔"[1]

سب سے زیادہ مال و دولت اسی حملے سے سلطان کے ہاتھ آیا تھا۔ یمینی نے اپنی تصنیف* میں صرف جواہرات کے وزن بیان کیے ہیں جب کہ سبحان رائے اپنی تصنیف میں لکھتا ہے "جب مالِ غنیمت سمیٹا تو اس میں سونے کا وہ بت بھی تھا جو وزن کرنے پر اٹھانوے ہزار تین سو مثقال پختہ (نو من چوبیس سیر) کا تھا۔ اس کے علاوہ پانچ لاکھ بیس ہزار درم، ترپن ہزار غلام اور تین سو پچاس ہاتھی بھی تھے۔"[2]

سومنات میں کوئی بھی قابلِ ذکر سونے چاندی کا بت نہ تھا جس کا کہ وزن کیا جاتا بلکہ خود منات بھی مقناطیسی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اسی لیے بعض لوگ اسے لوہے کا یا مقناطیس کا خیال کرتے تھے کیونکہ یہ ہوا میں معلق تھا، اور جب اس کے معلق ہونے کے بارے میں محمود غزنوی نے رائے لی تو ایک عقل مند شخص نے کہا "میرے خیال میں یہ بت خانہ مقناطیس کا بنا ہوا ہے اور بت لوہے کا ہے۔ اس کے بنانے والے کی یہ کاری گری ہے کہ اس کو ہر طرف سے مقناطیس اپنی طرف کھینچے ہوتے ہے، جس کی وجہ سے ہر طرف سے یہ بت ایک طرف سے دوسری طرف اور اوپر سے نیچے نہیں ہو سکتا لہٰذا بیچ میں گھڑا ہوا ہے۔ ایک گروہ اس نظریے کی تائید میں تھا اور دوسرا مخالفت میں، ان میں سے ایک شخص نے سلطان سے کہا کہ آپ مجھے حکم دیں کہ دو پتھر بت کے سر پر سے ہٹا دوں تاکہ بھید آشکار ہو جائے۔ بادشاہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا، جب دو پتھر ہٹائے گئے تو بت ٹیڑھا ہو گیا اور ایک طرف جھک گیا۔ اس طرح پتھروں کو ہٹا ہٹا کر بت کو نیچے لے آئے یہاں تک کہ وہ زمین سے ٹک گیا۔"[3]

اگرچہ یہ حوالہ بیہقی کی تصنیف سے لیا گیا ہے لیکن اس بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اصل تصنیف مٹ چکی ہے اور حوالوں کی مدد سے ایرانی حکومت نے اس کو شائع کرایا تھا۔ لیکن خاص بات جو اس حوالے میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بت ہوا میں معلّق تھا اور سلطان خود حیران تھا، حالانکہ سلطان کا حملہ سومنات تقریباً آخری حملہ تھا اور اس سے قبل اس کے کئی حملے ہندوستان پر ہو چکے تھے اور ان حملوں میں یہ ناممکن ہے کہ

---

[1] العتبی، ابوالنصر محمد بن عبدالجبار، "تاریخ یمینی"، ص ۲۴۴　[2] سبحان رائے بٹالوی، "خلاصۃ التواریخ"، ص ۲۲۸

[3] بیہقی، "تاریخ بیہقی"، ص ۶۹

اس نے اس طرح کے بت جو ہوا میں معلق تھے نہ دیکھے ہوں، کیوں کہ جا بجا ایسے بت خانے بنے ہوتے تھے۔ محمود کے حملوں سے پچاس برس قبل مرتب کی جانے والی کتاب "الفہرست" میں محمد بن اسحاق ابن ندیم لکھتے ہیں "ایک بت خانہ ملتان میں ہے، کہتے ہیں، یہ سات بڑے بت خانوں میں سے ایک ہے، اس میں لوہے کا سات ہاتھ لمبا ایک بت ہے، جو گنبد کے وسط میں واقع ہے۔ اس بت کو تمام اطراف سے یکساں طور پر سنگِ مقناطیس نے گھیر اور روک رکھا ہے۔"[1] لہٰذا ایسے مستند حوالے کے ہوتے ہوئے اور یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ محمود غزنوی نے ملتان پر کئی دفعہ فوج کشی کی تھی اور آخر میں سومنات میں داخل ہوا تھا تو ایسی صورت میں اس بات کا کوئی جواز نہیں رہتا کہ محمود سومنات کے مندر میں بت کو دیکھ کر حیران و پریشان ہوا ہو، اور نہ سومنات کی دولت اُسے وہاں لے کر گئی تھی، کیونکہ مہانگر کا بت خانہ اس سے زیادہ مال و زر کا مالک تھا، جس میں بیس ہزار بدھ کے مجسمے تھے اور ابن ندیم کے زمانے میں بھی یہ بت خانہ قائم تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ (بیس ہزار بدھ کے مجسمے) جو گوناگوں اور قیمتی جواہر مثلاً سونا، چاندی، لوہا، پیتل، ہاتھی دانت وغیرہ سے مرصع ہیں"[2] اسی طرح ایک اور بت خانہ جو مکران و قندھار کے قریب واقع تھا، اس بت کے بارے جو یہاں رکھا ہوا تھا، ابن ندیم لکھتے ہیں۔ "وہ سونے سے بنا ہوا ہے، اس کا طول و عرض سات سات ہاتھ اور بلندی بارہ ہاتھ ہے، گوناگوں جواہر سے مرصع ہے۔ اس کے بت یاقوتِ احمر اور موتیوں سے مرصع شان دار قیمتی پتھروں سے بنے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ایک موتی چڑیا کے انڈے کے برابر یا اس سے بھی بڑا ہے۔"[3]

الفہرست کے مستند حوالوں کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمود کے مرنے کے بعد سومنات کی فتح کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ یہ سب مسلمان حملہ آوروں کے قدم جمانے کے لیے بعد کے مسلمان سلاطین کے زمانے میں دانستہ طور پر کیا گیا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ مالِ غنیمت کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہوں۔

درحقیقت محمود غزنوی کے حملے کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ منات کے بت کو پامال کیا جائے، اسی لیے اس نے اس بت کو سومنات کے مندر میں نہیں توڑا اور نہ جلایا بلکہ اپنے ساتھ لے آیا۔ اس رائے کا اظہار منہاج سراج نے اپنی تصنیف طبقاتِ ناصری میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "سومنات سے منات کا بت (غزنی) لے آیا اور اس کے چار ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا غزنہ کی مسجدِ جامع میں رکھا، دوسرا سلطان کے

---

[1] "الفہرست" محمد بن اسحاق ابن ندیم۔ اردو ترجمہ محمد اسحاق بھٹی، ص ۷۹۹

[2] "الفہرست" ترجمہ محمد اسحاق بھٹی، ص ۷۹۹ [3] ایضاً، ص ۸۰۱

محل میں، باقی دو ٹکڑے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیج دیئے گئے“[۱] یہ بات صرف منہاج سراج ہی نے نہیں لکھی بلکہ سومنات کے واقعے کے ارسٹھ[۶۸] سال بعد ۴۸۴ھ میں نظام الملک طوسی نے اپنی تصنیف ”سیاست نامہ“ میں بھی اس واقعے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ محمود کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان بہ اتنی دور گیا کہ سومنات تک لے لیا اور منات اپنے ساتھ لے آیا۔“[۲]

ان مستند تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ محمود نے منات کو سومنات میں نہیں توڑا اور نہ اُسے اس مندر کی دولت کی ضرورت تھی۔ پھر یہ کہ اس سے زیادہ سونے چاندی سے بھرے ہوئے مندر دیگر علاقوں میں بھی تھے جو غزنی سے زیادہ قریب تھے، اس لیے اس مختصر مضمون میں عام مندروں کی دولت کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے تاکہ قارئینِ کرام اس سلسلے میں خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ ۷۲ سے

اعلام (شخصیات) اور ۲۲۹ احادیث مبارکہ کے علاوہ اماکن وبلدان (شہر اور ملک) اور قبائل کی تخریج بھی کی گئی ہے۔

اس مقالے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ تفسیری اقوال و آراء کی تفسیر قرآن کے معروف و مستند اور بنیادی مآخذ (Original Sources) بالترتیب تفسیر الطبری، تفسیر البغوی، زاد السیر، تفسیر البیضاوی، تفسیر النسفی، تفسیر الخازن، تفسیر ابن عباس اور تفسیر الجلالین سے تخریج کی گئی ہے۔ اس مقالہ میں ہر قطعہ آیت کے سامنے ایک ہی سطر میں تفسیر اور آٹھوں مصادر کے حوالے بمعہ صفحہ اور جلد نمبر درج کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ مقالہ بنیادی مآخذ تفسیر کے کیٹلاگ / منی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں طالب تفسیر کو کسی بھی آیت کی تفسیر کے لئے آٹھوں بنیادی مآخذ تفسیر سے رجوع کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ ایک ہی سطر اور ایک ہی نظر میں تمام تفصیلات بہم میسر آجائیں گے۔ (اعجاز فاروق اکرم، فیصل آباد)

---

[۱] طبقاتِ ناصری، ص ۴۱۲ [۲] سیاست نامہ، ص ۱۳۷

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

قارئین بنام مدیر

افکار و تاثرات

تعلیمی اداروں کی رجسٹریشن فیس کی مذمت

محمد اسلم رانا (ایڈیٹر المذاہب) نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی رجسٹریشن کے لئے دو لاکھ روپے زرضمانت اور رجسٹریشن فیس دس ہزار مقرر کیے جانے پر سخت نقطہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حکومتی اقدامات جاگیردارانہ ذہنیت کے عکاس ہیں۔ ان سے تعلیم محدود اور مہنگی ہوگی۔ انہوں نے مزید کہا کہ معین قریشی دور میں غیر ممالک میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے منظور کیے گئے چار سو وظائف کو منسوخ کرکے موجودہ حکومت پہلے ہی ملک کو پسماندہ رکھنے کا کریڈٹ حاصل کر چکی ہے۔

پاکستان کے دینی اداروں کے بارے میں مغربی پریس کی تشویش

مغربی پریس میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں پاکستان کے دینی اداروں کی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون میں کہا گیا ہے کہ دنیا بھر کے اسلام پسند پاکستان سے عالمی سطح پر ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں دینی ادارے ایک عرصے سے اسلامی مجاہدین کی تربیت گاہوں کا روپ دھار چکے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کے لئے یہ گھومنے والے پہیے کا کام دیتے ہیں۔ اخباری مضمون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پاکستان اور بھارت پچاس برسوں سے کشمیر میں الجھے ہوئے ہیں۔ جب اپریل میں پہاڑی چوٹیوں سے برف پگھلنا شروع ہوتی ہے تو تربیت یافتہ مجاہدین جہاد کے لئے پہاڑیوں کی وادیوں میں اتر جاتے ہیں۔ کشمیر کی جنگ

کا انجام کچھ بھی ہو ، پاکستان میں جہاد کی غرض سے تیار کئے جانے والے نوجوانوں کی غیر معمولی تعداد بھارتی وفاع کو نقصان پہنچا سکتی ہے ۔ پاکستان میں کوئی ۶۔لاکھ طلبہ آٹھ ہزار دینی مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں ، ان کے لئے وہاں پر رہائش کا انتظام بھی ہے ۔ ان مدرسوں کی ایک تہائی تعداد بندوق بردار عسکریت پسند ہے ۔ اخبار نے لکھا ہے کہ اگر پاکستان کی اسلام پسند جماعتوں کا اتحاد ملی یکجہتی کونسل کی شکل میں کامیاب ہوگیا تو اسے اڑھائی لاکھ ایسے نوجوانوں کی خدمات حاصل ہوجائیں گی جو دین اسلام کی خاطر وطن پر جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے ۔ اخبار نے نوجوانوں کے لئے تیار کئے گئے بعض تربیتی مراکز کا بھی ذکر کیا ہے ۔

قرآن مجید کا روسی زبان میں ترجمہ

قرآن مجید کا پہلی بار روسی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہوگیا ہے ۔ یہ ترجمہ ایک شامی عالم نے اپنی روسی بیوی کی مدد سے کیا ہے ۔ اخبار عرب نیوز کے مطابق اس سے قبل عیسائی پادری دو مرتبہ روسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کرچکے ہیں ۔ ان میں پہلا ترجمہ ۱۹۰۷ اور دوسرا ۱۹۶۶ میں شائع کیا گیا تھا ۔ شامی عالم ڈاکٹر محمد سعید الرشید نے قرآن پاک کے روسی زبان میں ترجمہ کا کام ۱۹۷۵ء میں شروع کیا تھا جب وہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے ماسکو گئے تھے جہاں انہوں نے ایک روسی لڑکی سے شادی کرلی ۔ فلیریا ماسکو یونیورسٹی میں ٹیچر تھی ، انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور اپنا نام فاطمہ رکھا ۔ ترجمہ کی پہلی جلد ۱۹۹۲ء دوسری ۱۹۹۳ء اور اب تیسری جلد بھی شائع ہوگئی ہے ۔

امریکہ میں مسلمان

امریکی سفارتی اطلاعاتی ادارے ایس آئی ایس کے ایک پریس ریلیز کے مطابق امریکہ میں مسلمانوں کی مردم شماری کا اندازہ ۵۰ سے ۸۰ لاکھ کے درمیان ہے ۔ ۲۵ کروڑ کے اس ملک میں گویا ہر تیسواں مسلمان ہے ، جو بہت اہم بات ہے ۔ آج سے چند برس قبل مسلمانوں کی یہ تعداد اس کے نصف تھی ۔ بیرون ممالک خاص طور پر عرب ممالک سے مسلمانوں کی امریکہ آبادکاری کے علاوہ مقامی طور پر بھی مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور ہر سال اوسطاً ۵ ہزار امریکی شہری اسلام قبول کرتے ہیں جن میں سے ۴ ہزار افریقی نسل کے اور ایک ہزار گورے ہوتے ہیں ۔

اکیسویں صدی میں روس اسلام کے سائے میں آجائے گا

ماسکو میں مسلم آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اور تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق روس میں آباد دو کروڑ مسلمان آئندہ ۲۰ برس میں چار کروڑ ہوجائیں گے ۔ روسی روزنامے

نیزاوزنانا" نے لکھا ہے کہ روس میں اتنی تیزی سے مسلم آبادی میں اضافہ سے اس خطہ میں اسلام
ا اشاعت بھی بڑھے گی اور آئندہ صدی میں روس میں پھیلنے والا مذہب اسلام ہی ہوگا۔ اخبار نے
ما ہے کہ کمیونسٹ دور حکومت کی مشینری کی جانب سے مذاہب کے خلاف مہم کے باوجود
سلمانوں کے عقائد کو متزلزل نہیں کیا جاسکا اور مسلمانوں کی تہذیب کی جڑیں اس دور میں بھی
ضبوط رہیں جس کے باعث اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ صدی میں اسلامی تہذیب اس ملک میں
ی سے فروغ حاصل کرے گی جبکہ دیگر مذاہب اور ثقافتیں اس سے شکست کھاجائیں گی۔

نیا کے ایک معروف پادری کا قبول اسلام

ممباسا (کینیا) کے علاقہ میں واقع ایک بستی کے گرجاگھر کے ایک معروف پادری میتھیو بونایا
نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس نے اپنا نام محمد عمر رکھا ہے۔ موصوف ۱۹۹۲ء میں
نے آبائی وطن غرسینی میں پیدا ہوئے کلیۃ الاھوت سے عیسائیت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے
۔اس کے اشاعت میں لگے رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے
لے گروپوں کے ساتھ ملکر اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ایک منظم منصوبہ بندی کی
۔ عیسائیت کی خدمت کرتے رہے۔ گزشتہ سال جب تنزانیہ سے تبلیغی جماعت یہاں آئی اور ممباسا
ے علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا تو انہوں نے اسکی زبردست مخالفت کی اور مختلف
اقع پر قسم قسم کے سوالات کرکے انہیں پریشان کیا۔ اسلام کے خلاف انکی جدوجہد کو دیکھتے
ئے گرجاگھر کی مجلس انتظامیہ نے انہیں مزید تعلیم اور اعلیٰ ٹریننگ کے لئے امریکہ روانہ کرنے کی
ی منظوری دی لیکن چند دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے انکے دل میں اسلام کی حقانیت واضح کردی
۔ انہوں نے کھلے عام اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور گرجاگھر کی ساری چابیاں اور دوسری
ستیں انہوں نے دوسرے پادریوں کے حوالہ کردی۔ پادریوں نے موصوف کو عیسائیت کی طرف
بارہ لانے کی بہت کوششیں کیں مگر وہ اس میں ناکام رہے بلکہ موصوف نے ان پادریوں کو
لام کی حقانیت اور اسکی صداقت بتلائی اور ان سے کہا کہ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اسلام
ل کرلو۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

(نوٹ) جو شخص بھی اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ بات کھل
ئے گی کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو دونوں جہاں میں کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی
یمات سے روگردانی کرنے والا دنیا میں بھی سکون حاصل نہیں کرسکتا۔ برطانیہ کے ان تمام عیسائی
ہی رہنماؤں کو (جو اس وقت اپنے اپنے مذہبی افکار و عقائد سے بیزار ہوکر چرچ چھوڑتے

جارہے ہیں) چاہیئے کہ وہ اسلام کا صدق دل سے مطالعہ کریں اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہ کریں تو
انشاء اللہ وہ صحیح منزل پالیں گے اور دین دنیا میں سرخرو ہوجائیں گے ۔

بنکنگ سیکٹر دیوالیہ ہونے کا خطرہ

پاکستان میں بنکوں اور مالیاتی اداروں سے حاصل کردہ قرضوں کی مالیت ۱۰۰ ارب روپوں تک جا پہنچی ہے جن کی واپسی کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے ۔ بااثر سیاستدانوں ، بڑے تاجروں بنک افسروں اور یونین لیڈروں کی ملی بھگت سے بنکوں کو منظم ہاتھوں سے لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ملک کے بڑے بڑے بنک عملی طور پر بیمار ہیں ۔ بنکنگ سیکٹر کے دیوالیہ ہونے سے وزیراعظم بےنظیر زرداری کی حکومت کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہوجائیں گی ۔

نام نہاد بنگلہ دیش

بنگلہ دیش پارلیمنٹ کے رکن ظہیر احمد فرید نے (جو آجکل پاکستان آئے ہوئے ہیں) کہا ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی سیاست میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے ارکان اسمبلی پجارو پر سفر کرتے ہیں لیکن بنگلہ دیش کے اکثر ارکان اسمبلی سائیکل پر اجلاس اٹینڈ کرنے آتے ہیں ۔ پاکستان میں ان پڑھ وزیر بن جاتا ہے لیکن بنگلہ دیش میں صرف گریجویٹ ہی الیکشن میں حصہ لے سکتا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیش کے وزیر کے اخراجات آپ کے چپڑاسی کے اخراجات سے کم ہیں ۔ وہاں کا وزیراعظم ہاؤس تین بیڈ رومز تک محدود ہے جبکہ آپکا پرائم منسٹر ہاؤس شاہی محل سے کم نہیں ہے ۔ (نوائے وقت)

زبدۃ التفاسیر ۔ تفسیر ریفرنس بک ۔ ایک جائزہ

پی ایچ ڈی کے لئے یہ مقالہ (Thesis) ممتاز محقق ، استاذ اور دانشور ڈاکٹر ظہور صدر شعبہ عربی پرنسپل اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کی نگرانی اور رہنمائی میں شعبہ عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے استاذ اعجاز فاروق اکرم نے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا جو عربی زبان میں ڈھائی ہزار صفحات اور چار / چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اس کی بنیاد برصغیر / کشمیر کے معروف نقشبندی بزرگ خواجہ خاوند محمود الملقب بہ حضرت ایشاںؒ (م ۱۰۵۲ ھ) کے صاحبزادے خواجہ معین الدین کشمیریؒ (م ۱۰۸۵ ھ) کی بادشاہ عالمگیرؒ کو پیش کردہ قلمی تفسیر زبدۃ التفاسیر کے مخطوط (Maruscript) پر ہے ۔ اس Thesis میں اس قلمی تفسیر کے دنیا میں موجود چار مخطوطوں پنجاب یونیورسٹی لاہور ، کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ ، خدا بخش لائبریری پٹنہ ، ایشاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ کی مائیکرو فلموں کے ذریعے تقابل ، تصحیح اور حواشی کا کام کیا گیا ہے ۔ جبکہ تفسیر میں وارد ۱۶۲

 باقی صفحہ ۵۹ پر